آخری رات
افسانے
نعیم کوثر
Rs. 150/-

آخری رات

(افسانے)

نعیم کوثر

"AAKHRI RAAT"

(Short stories)

by

NAEEM KAUSAR

Year of edition 2012

Price-Rs.150/-

نام کتاب : آخری رات۔

مصنف : نعیم کوثر

سنِ اشاعت : ۲۰۱۱ء

کمپوزنگ : محمد نعیم انصاری، بھوپال، موبائل:۔ 09300989834

قیمت : ایک سو پچاس روپے

تعداد : ۴۰۰

صفحات : ۱۶۰

سرورق : محمد نعیم انصاری۔

مطبع : اسٹار آفسیٹ، ایم پی نگر بھوپال۔

ملنے کا پتہ : ۳۱، شملہ ہلز، فردوس، کاٹیج، بھوپال۔ 462002

موبائل نمبر : 09200000905

مصنف کی دیگر کتب:

(۱) خوابوں کے مسیحا۔ ۱۹۹۹ء

(۲) کال کوٹھری (دوایڈیشن) ۲۰۰۱ء

(۳) اقرارنامہ۔ ۲۰۰۶ء

(۴) اگنی پریکشا۔ ۲۰۰۹ء

انتساب

اپنے اِس پانچویں مجموعے کو معنون کرتا ہوں

صحافت کی بے غلاف شخصیت، زبان و ادب
اور بشر دوستی کے ممتاز فکشن نگار

نند کشور وکرم

اور

مقبول نثر نگار، شاعر، افسانہ نویس اور قلمی چہرہ کے موجد

پروفیسر ظفر احمد نظامی

کے نام

نام و نمود سے بے نیاز یہ دونوں تخلیق کار
آخری سانس تک میرے دل کی دھڑکنوں میں شامل رہیں گے۔

نعیم کوثر

فہرست

☆☆☆

کالا دوپٹّہ

اظہر نے ماضی میں کچھ پل کھو جانے میں بہتری سمجھی کہ کال کوٹھری میں بھیانک رات کا تقاضہ یہی تھا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ اُسے سزائے موت ملنی طے ہے۔ آٹھ سال بیت گئے۔ اظہر کی دس سالہ بھانجی ریشما اسکول سے آتے وقت راستے سے گُم ہوگئی۔ شام پانچ بجے تک وہ گھر نہیں پہنچی۔ بہن بہنوئی کے گھر میں کہرام مچ گیا۔ وہیں اظہر اور امّی بھی ہوش وحواس کھو بیٹھے۔ بارہ گھنٹے کی تلاش کے بعد ریشما کا بے جان جسم میونسپل پارک کی جھاڑیوں میں ملا۔ شلوار خون میں لت پت پڑی ہوئی تھی۔

امّی کو جب پتہ چلا کہ بیٹے نے عدالت میں اپنا جرم قبول کرلیا ہے۔ تو وہ چکرا کر گر پڑیں۔ سر دالان کے کھمبے سے ٹکرایا اور خون کا فوارہ اُبلنے لگا۔ وہ تو اچھا ہوا ماموں آئے ہوئے تھے۔ آٹو میں ڈال ہاسپٹل لے دوڑے۔ مگر ڈاکٹر کچھ نہ کر پائے۔ اُن کا کلیجہ پہلے سے چھلنی تھا۔ اب بیٹے کے اعتراف گناہ کی خبر نے دل کی دھڑکنیں بھی روک دیں۔ فاسٹ ٹریک کورٹ میں فیصلہ سنائے جانے میں کچھ ہی دن باقی تھے۔ اظہر سزا کے خوف سے بے چین نہ تھا۔ امّی کی موت کی خبر نے اس کے حوصلے پست کردیے۔ اس نے سورج سنگھ جیلر کو دو دِن کے پیرول کی درخواست دی۔

جیل کی تنگ بیرک میں سانس لیتے اظہر کو ایک سال بیت گیا تھا۔ وہ مشہور انگریزی اخبار ''سن رائز'' کا سب ایڈیٹر تھا۔ بے باک پتر کار کی حیثیت سے اس کی ایڈمنسٹریشن اور سماج میں کافی عزت اور شہرہ تھا۔ پولس کے مظالم، رشوت خوری، مافیا گروہ اور پیشہ ور دنگائیوں کی سازشوں کو اُجاگر کر کے اظہر نے بہت نام کمایا تھا۔ جس

دن اس نے جیل میں قدم رکھا اور سورج سنگھ جیلر کے کمرے میں داخل ہوا۔ تب ہی وہ سمجھ گیا تھا کہ خونخوار شیر کی مانند میں باقی دن گذارنے ہیں۔ اس نے بار ہا شہر کے پولس اسٹیشنوں میں چھوٹے بڑے خاکی وردی دھاریوں کے ایسے کرتوت دیکھے تھے جن کا نظارہ اچھے اچھوں کے ازار بند ڈھیلا کر دینے کو کافی تھا۔ یہاں اس نے وہ راکشس بھی دیکھے جو جن سیوا کا مکھوٹا لگائے قانون اور انسانیت کو سرہانے کا تکیہ سمجھتے تھے کہ جب جی چاہا ٹانگوں کے بیچ دبا کے بھینچ لیا۔

جیل کی کوٹھری میں اظہر شدید گھٹن اور بے چینی محسوس کرتا۔ پہلے وہ دن دن بھر موٹر سائیکل پر سوار محلے محلے گھومتا، پولس تھانوں سے اہم خبریں لیتا۔ سکریٹریٹ اور دوسرے محکموں میں سرکار کے فیصلوں اور سرگرمیوں کی سن گن لے کر شام کو اخبار کے دفتر میں رپورٹ تیار کرنے میں مصروف ہو جاتا۔ دیر رات کو گھر لوٹتا تو امّی کو پلنگ پر بیٹھے انتظار کرتے دیکھ فوراً ہاتھ منہ دھو لیتا اور تیز قدموں سے چلتا ہوا امّی سے جا لپٹتا۔ جب سے ہوش سنبھالا اور ۲۸، سال کی عمر تک وہ گھر میں داخل ہوتے ہی امّی کو بانہوں میں سمیٹ لیا کرتا تھا۔ تیزی سے اونچے قد کی طرف بڑھتی چھوٹی بہن نازنین کے ہاتھ پیلے کرنے کی فکر میں اس نے امّی کی بہو لانے کی ضد کو نظر انداز کر رکھا تھا۔ تحصیل کے ہیڈ کلرک اسلم خان سے نازنین کا نکاح پکّا کرانے کے لیے اس نے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا۔

معمول کے مطابق اس دن بھی سورج سنگھ گشت لگاتا ہوا اظہر کی بیرک کے سامنے آیا مسکرایا اور پوچھا ''اب تو بتا دو پترکار''۔ سورج سنگھ جب بھی وہاں آتا یہی سوال کرتا اور اظہر ہنس دیا کرتا۔ ایسی ہنسی جس میں خوف اور دہشت کی ذرا بھی جھلک نہ ہوتی۔ چہرے پر ہمیشہ جیسی بے فکری اور لاأبالی پن چھایا رہتا۔ سورج سنگھ نے پھر سوال دہرایا۔

مجھے بتانے میں حرج کیا ہے؟ تم نے پہلے ہی پیشی میں اپنا جرم قبول کر لیا تھا۔ مگر

ایسا گھناؤنا کام کرنے کی کوئی تو وجہ ہوگی''۔

''چھوڑیئے بھی جیلر صاحب'' کچھ جرم ابارشن کی طرح ارادے کے بغیر سرزد ہوجاتے ہیں''۔

سورج سنگھ نے اظہر کو کافی کریدا لیکن وہ چپ رہا۔ پھر اچانک کہہ اٹھا، ایک کام کردیں۔ بڑا احسان ہوگا'' سورج سنگھ نے رضامندی جتائی تو اظہر نے دو کتابوں کے نام بتاتے ہوئے کہا کہ برٹش لائبریری میں آسانی سے دستیاب ہو جائیں گی۔ اپنی پاکٹ ڈائری میں لکھتے ہوئے سورج سنگھ وہاں سے لوٹ آیا۔

پولس ریشما کے قاتل کی دھر پکڑ میں ناکام رہی۔ امّی دل پکڑ کے بیٹھ گئیں۔ نازنین اور اسلم دن رات آسمان کے تارے گنتے رہ گئے۔ ہر ایک کی نیندیں اڑ گئیں۔ دُکھ کا ایسا پہاڑ ان کے سب کے اوپر آگرا کہ کھانا پینا دوبھر ہوگیا۔ اسلم خان مہینوں دفتر سے چھٹی لے کر گھر پر بیٹھا رہا۔ اس نے کئی بار اظہر سے کہا تھا کہ ریشما کی دردناک چیخیں اس کے دل و دماغ پر چابک برساتی رہتی ہیں اور جی چاہتا ہے کہ ایک بار ویسی ہی چیخ سن لوں۔ بس باقی زندگی اس کی یادوں پر قربان سمجھو۔

اظہر نے رات آنکھوں آنکھوں میں کاٹ دی۔ امّی کی یاد آئی تو ایسی آئی کہ آس پاس کے بیرکوں سے گونجتے بے بس خرّاٹے امّی کے ہاتھ سے گندھے گرم میٹھے ملیدے کی خوشبو میں کھو گئے۔ اسکی اور نازنین کی پیدائش کے وقت امّی کا دودھ اترنے سے ایسا شرمایا کہ دو سال تک کانچ کی صاف شفاف شیشی سے دودھ پلاتی رہیں۔ کتنی احتیاط سے دن میں تین بار شیشی کو گرم پانی میں اُبالتیں آغوش میں لے کر کالے دوپٹے سے آڑ کر لیتیں کہ کسی کہ بری نظر نہ لگے۔ جس گھٹنے پر سر ہوتا اسے ہولے ہولے ہلاتیں کہ اپنی سوکھی چھاتی کی چاہت اور پاکیزگی کا احساس جاگتا رہے۔ ربر کی نرم چسنی چوسنے کی ہلکی ہلکی آواز امّی کو جیسے بادِ صبا کا احساس کراتی۔ لڑکپن میں اظہر کو وہ یہ سب سناتیں تو خوشی سے ان کی آنکھیں نم ہو جاتیں امّی کُرتا اور چوڑی دار پائجامہ یا شلوار

کسی بھی رنگ کا پہن لیا کرتی تھیں لیکن دوپٹہ ہمیشہ کالا اوڑھتی تھیں۔ اظہر سے کہتیں کہ تمھارے ابا مرحوم کو یہی رنگ پسند تھا۔ اظہر نے اس دوپٹے کو بہت سنبھال کے تہہ کیا تھا اور سلیقے سے اپنی الماری کے لاکر میں رکھ چھوڑا تھا۔ اس نے نازنین کو پابند کیا تھا کہ یہ دوپٹہ ہماری مشترکہ وراثت ہے۔ جو دودھ کی پاکیزہ سفیدی کو بدرنگ ہونے سے محفوظ رکھے گی۔

اظہر جیل کے گھنٹے کی دہشت ناک گرج سن رہا تھا۔ جو دیواروں کو پھلانگتی رات کے سناٹے میں جانے کہاں کہاں کانوں سے ٹکراتی ہوگی۔ تب اس کا ہاتھ آنسوؤں سے بھیگی شرٹ کی نمی کو چھوتا اور وہ گرن سہلانے لگا۔ پندرہ سال کا ہوجانے پر بھی امّی گردن پر لال تیل کی مالش کرتیں اور پیار سے کہتیں۔

''اجو۔ تجھے اللہ نے صراحی دار گردن دی ہے۔ تُو یہ گردن نازنین کو دے دے۔ لڑکیوں پر بجتی ہے''۔

''امّی تیل کی مالش کیوں کرتی ہو۔ کیا فائدہ ہوگا''

''مردوں کی گردن فولادی ہونی چاہیئے بیٹا۔ تاکہ آخری سانس تک گھر گرہستی کا بوجھ اٹھا سکے اور دماغ کو طاقت ملے''۔

یہ الگ بات کہ اس کی گردن موٹی نہیں ہوئی۔ مگر ممتا کی ریشمی لکیروں سے گنجان ہتھیلی کی تھپکیوں نے اُس کے بازو اور دماغ میں سوچ سمجھ کی توانائی، محبت، سچائی اور قربانی کا بے پناہ جذبہ بھر دیا تھا۔ اظہر جانتا تھا کہ اس نے جو کچھ کیا ہے۔ اس کا مہلک اثر امی کے دل پر ضرور ہوا تھا۔ انہوں نے اپنے لاڈلے بیٹے سے ایسے گندے اور نیچ عمل کا تصور بھی نہیں کیا ہوگا۔

سورج سنگھ کی نیک دلی اور ہمدردی پر اظہر کو بھروسہ تھا کہ اسی لیے اس نے پیرول کی درخواست دے دی تھی۔ سورج سنگھ نے موافق نوٹ بنا کر گھنٹہ بھر میں ڈاک چپراسی سے ڈائریکٹر جنرل پولس کو بھجوا دیا۔ اسی دن اعلیٰ حکام سے منظوری آ گئی۔ ایک

گھنٹے کی مہلت ملی تھی۔ سورج سنگھ کی شرافت ایک بار اور جاگی۔ جیل کی جیپ جو اس کے استعمال کے لیے الاٹ تھی۔ اس میں چار ہتھیار بند سپاہیوں کے ساتھ اظہر کو روانہ کیا۔ یوروپین اسٹائل کی ہلکی ہتھکڑی نے دونوں ہاتھ گرفت میں لے رکھے تھے۔ وہ گھر پہنچا اور دروازے پر تالا لٹکا دیکھ اوسان خطا ہو گئے۔ پڑوسی نے بتایا کہ چابی اسلم بھائی کے پاس ہے اور جنازہ آدھا گھنٹہ پہلے قبرستان گیا ہے۔ وہ پھوٹ کر رو پڑا۔ حولدار نے گاڑی میں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ جیپ نے بھیڑ بھاڑ والی سڑک کو پار کیا اور قبرستان کے گیٹ پر آ کر رک گئی۔ سپاہیوں کے پیچھے چلتا ہوا وہ اس مقام پر آیا جہاں لوگوں کا ہجوم تھا۔ سب نے اسے دیکھا اور ایک طرف ہٹتے ہوئے راستہ دیا کہ قبر تک پہنچ سکے۔ امّی منوں مٹی کے نیچے جا چکی تھیں۔ وہاں موجود زیادہ تر لوگ دو مٹھی مٹی دے چکے تھے۔ اظہر کے ہونٹ بادبان کی طرح تھرتھرائے پیشانی پر اداسی چھا گئی اور بے قرار انداز میں مٹی کے ڈھیر پر بیٹھ گیا۔ اس نے حسرت سے دونوں ہاتھ کے محدود فاصلے پر نگاہ ڈالی جو صرف اُتنا ہی تھا جتنا اُن دنوں امّی ہتھیلیوں پر آٹے کی لوئی پھیلاتے رکھتی تھیں۔ وہ مٹی ڈالنے میں مصروف تھا۔ سب اُس کام سے فارغ ہو چکے تھے مگر وہ مٹی ڈالتا ہی رہا۔ تب ہی اسلم خاں نے اس کے بازوؤں میں ہاتھ ڈال کے اٹھایا اور چھاتی سے لپٹا لیا۔

''چلیئے بھائی چلیئے'' حولدار بولا۔ اس کے ساتھی سپاہی بھی آ گئے۔ ایک نے ہتھکڑی سنبھالی۔ اظہر چپ چاپ اسلم خان کے جسم سے ہٹا۔ دل نے محسوس کیا جیسے نازنین کی مہکتی ہچکیاں اس کی رگوں کے خون میں ہلچل مچا رہی ہوں۔ کمزور لہجے میں اسلم کو مخاطب کیا۔ ''نازنین کو اس کے بھائی کا ڈھیروں پیار دینا''۔ وہ تیزی سے سپاہیوں کے پیچھے چل دیا۔ پل بھر کو پیچھے مڑ کے دیکھا، اشارے سے اسلم خان کو قریب بلایا اور کہا۔

''نازنین سے کہنا میری الماری کا لاکر کھلا ہوا ہے۔ اس میں صرف امّی کی ایک

چھوٹی سی امانت رکھی ہے۔اسے وہاں سے ہرگز نہ ہٹانا''

سورج سنگھ جیلر نے ضروری اندراج کرنے کے بعد کرسی سے اٹھتے ہوئے اظہر سے کہا

''عدالت سے سمن آگیا ہے۔آج دو تاریخ ہے سات کو فیصلے کی پیشی ہے گڈ لک''

اپنی اداسی اور امّی کی جدائی کو بھول جانے کے لیے اظہر نے سورج سنگھ کی لائی ہوئی کتابوں کی ورق گردانی شروع کردی۔ بے شمار فوٹو ہر صفحے پر آراستہ تھے۔جگہ جگہ انسان کے حیوان بن جانے کے واقعات درج تھے۔لفظوں کی قید سے آزاد ہو کر کتنے ہی کردار اپنے مجسم وجود کے ساتھ اس کے سامنے رقص کرنے لگے۔

☆ یہ ایک بلند قامت مجرم کا ناتھا۔ پچاس لوہار دو سال سے لوہے کی مضبوط چٹان پر بھاری بھرکم ہتھوڑے برسارہے تھے۔ بڑی بڑی بھٹیوں میں کوئلے دہک رہے تھے۔آخر وہ دن آگیا کہ دو فٹ چوڑا، تین انچ موٹا، چار فٹ کا ٹکڑا تیار ہوا۔ مہینے بھر نچلے حصے میں دھار کی گئی۔ اک ہاتھی کو بڑے جتن سے ہلاک کرکے اس کی ٹانگ پر آزمائش ہوئی۔بجلی کی طرح فولادی ٹکڑا گرا اور ٹانگ کے دو ٹکڑے ہو گئے۔کانے مجرم نے غریب دوشیزہ کی عصمت لوٹ لی تھی۔

☆ چھوٹے سے تالاب میں دس بھوکے مگرمچھ پانی پر غصہ اتار رہے تھے۔ سربراہ سلطنت نے ملک سے غداری کرنے پر چار افراد کو موت کی سزا دی تھی۔ پل بھر میں مگرمچھوں کی بھوک شانت ہوگئی۔

☆ بادشاہ نے اس خوبرو نوجوان کو شیر کے آہنی پنجرے میں ڈالنے کا اشارہ کیا جس نے شہزادی سے آنکھ لڑانے کی جرأت کی تھی۔

☆ ملک میں بھکمری اور غربت کے خلاف آواز بلند کرنے کے جرم میں قیصر نے بوڑھے پادری کی کھال کھچوادی اور اس میں بھس بھروادیا۔

صدیوں سے ایسا سلسلہ چلا آتا رہا۔ آدم کی اولاد سانپ بچھوؤں کے باڑے میں پھینکی گئی۔ ہاتھی کے پاؤں تلے روندی گئی۔ رسّی سے باندھ گھوڑے سے گھسیٹی گئی اور زمین میں زندہ دفن کی گئی۔

رات کے تین بج چکے تھے۔ اظہر کی آنکھوں سے نیند غائب تھی۔ اس نے کتاب بند کر دی۔ اپنے عمل پر اسے ذرّہ برابر شرم اور پچھتاوا نہیں تھا۔ ذہنی طور پر بالکل مطمئن اور بے فکر کہ اس نے جو کچھ کیا وہ وقت کا تقاضہ اور بہن کے زخم کو ناسور بن جانے سے بچانا تھا۔ اس کا گھر ملیا میٹ ہو جاتا۔ اظہر ہر طرف چھائی خاموشی میں صرف جھینگروں کی آواز سن رہا تھا۔ اس نے کروٹ بدلی اور اپنی پنڈلیاں کھجانے لگا۔ مچھر اور کھٹمل سال بھر سے جلاد کی رسّی کا بوجھ ہلکا کر رہے تھے۔ صبح ہونے تک اس کا یہ خیال یقین میں بدل گیا کہ اگر درندوں کے نکیلے دانت توڑ دیئے جائیں ان کے ناخن اکھاڑ دیں تو جنگل کے چپے چپے میں سارے چرند و پرند بے خوف ہو کر اپنی زندگی جی سکیں گے۔ کہیں سے کسی نرم و نازک حلق سے گھٹی چیخ موت کا اعلان نہیں کر ےگی۔

عدالت لے جانے کے لیے ہتھیار بند پہرے دار آئے اور اظہر اسی انداز میں اپنی بیرک سے باہر نکلا جس طرح وہ اخبار کے دفتر سے باہر آتا تھا۔ دونوں ہاتھ کی انگلیاں ایک دوسرے میں پیوست تھیں۔ سورج سنگھ نے فارم بھر کے دستخط کر دیئے تھے۔ پولس دستہ اظہر کو لے جانے کے لیے موجود تھا۔ سورج سنگھ نے غور سے اظہر کی آنکھوں میں جھانکا۔ فکر، پریشانی اور مایوسی کے اتار چڑھاؤ تلاش کیے۔ تیس سال کی ملازمت کے دوران اس نے سینکڑوں مجرموں کو عدالت بھیجا تھا۔ ان میں سنگین جرائم والے غضبناک غنڈے بھی تھے اور چوری ڈکیتی اور چھوٹے عادی مجرم بھی۔ منجھے ہوئے سنگ دل قاتل مرجھائے سے سر جھکائے یوں باہر نکلتے جیسے وہ کسی اپنے کی ارتھی شمشان میں نذر آتش کرنے جا رہے ہوں۔ آخری انجام کا خوف ان کے چہروں پر صاف نظر آتا تھا۔ سورج سنگھ کرسی سے اٹھا اور اظہر کو جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ وہ اظہر کے

کارناموں سے اچھی طرح واقف تھا۔ کئی جیلوں میں اس نے ڈیوٹی انجام دی تھی لیکن تعلیم یافتہ اور مشہور جرنلسٹ سے پہلی بار واسطہ پڑھا تھا۔ اظہر کی کارستانی اخبارات کی شاہ سرخیوں میں پڑھتا رہا تھا۔ کوئی عینی گواہ نہیں تھا لیکن عدالت نے اظہر کے اقبالیہ بیان پر اسے قتل کا مجرم قرار دیا تھا۔ آج سزا کا اعلان ہونا تھا۔ مشکل سے پندرہ منٹ میں جج نے فیصلہ سنا دیا کہ مجرم کو پھانسی کی سزا دی جاتی ہے۔ اظہر کی نظریں کٹہرے سے اسلم خاں کی طرف اٹھیں جو غش کھاتی نازنین کو سنبھالنے کی کوشش کر رہا تھا۔

وہ رات جیل میں اظہر کی آخری رات تھی۔ ضلع جج نے بلیک وارنٹ جاری کر دیا تھا۔ صبح اسے سورج کی پہلی کرن اور جلاد کا سامنا کرنا تھا۔ جیل کی تاریک کوٹھری نے اظہر کو جدائی کے لمحات میں وہ واقعہ یاد دلا دیا۔ جب نازنین امی کے پاس آئی ہوئی تھی۔ اتوار کا دن تھا اظہر ایک پریس کانفرنس کی رپورٹ تیار کر کے دفتر سے جلدی اٹھ گیا۔ شام ہو چلی تھی۔ اس نے سوچا اسلم خاں سے ملتا چلے کہ ہوسکتا ہے کہ نازنین گھر لوٹ آئی ہو۔ گلی میں بجلی کے کھمبے کا بلب ٹوٹا ہوا تھا اور وہاں اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ اس نے زنجیر بجانے کو ہاتھ اٹھایا کہ اچانک دروازہ کھلا۔ اسلم خاں پسینے میں شرابور دیوانے کی طرح باہر آیا اور اظہر سے ٹکرا گیا۔ اس کے منہ سے الفاظ بھی نکلے تو ہانپتے کانپتے۔۔

''اظہر بھائی۔ وہ مر گئی۔ اللہ رسول کی قسم میں نے کچھ نہیں کیا۔ بس گردن پر دونوں ہاتھ رکھے اور وہ چیخ مار کے بے دم ہوگئی''۔

اظہر سمجھدار صحافی تھا۔ اسلم خاں نے کئی بار کہا تھا کہ اسے ریشما جیسی چیخ سننے کا جنون ہے۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ اسلم کا شک گلی میں رہنے والے لانڈری مالک اختر علی کے اوباش بیٹے عابد پر تھا کہ جس کی ہوس کا شکار ریشما ہوئی تھی۔ اس نے کئی بار عابد کی معصوم اور کمسن بچی کلثوم کو جارحانہ انداز سے گھورتے دیکھا۔

''اسلم تم امی کے پاس چلے جاؤ اور تسلی رکھو۔ میں یہاں ہوں''۔ گھنٹے بھر میں

پولس اور کلثوم کی لاش اٹھائی گئی اور اظہر کو ہتھکڑی پہنا دی گئی۔

اظہر نے دوسری کتاب اٹھائی۔ آخری صفحے پر عراق کے آمر صدام حسین کو پھانسی دینے کی بڑی سی تصویر تھی۔ پرسکون صدام حسین جلاد اور پھانسی کے پھندے کو دیکھ رہا تھا۔

''واہ کتنا سہانا اور دلیرانہ انداز ہے'' اظہر نے اتنی طاقت سے قہقہہ لگایا کہ بغل کی بیرک کا دبلا پتلا رامیشور بوکھلا کے نیند سے اٹھ کھڑا ہوا اور بھاری آواز میں وہیں سے چلایا۔ ''میاں تمہیں ہنسنے کی بیماری ہے؟ تمہارا جگہ تو پاگل خانہ ہے چھ مہینے ہو گئے۔ بار بار نیند سے جگا دیتے ہو'' اظہر نے کچھ نہیں کہا اور اطمینان سے بیٹھا رہا۔ صبح سویرے سورج سنگھ، مجسٹریٹ اور ڈاکٹر آ گئے۔ سورج سنگھ نے نرم آواز میں اظہر کو غسل کرنے اور نماز پڑھنے کا مشورہ دیا۔ کچھ دیر بعد اسے پھانسی کے چبوترے پر لے جایا گیا۔ مجسٹریٹ نے پوچھا۔

''تمہاری کوئی آخری خواہش ہے؟''

اظہر حسب عادت مسکرایا، سر پر ہاتھ پھیرا، گردن کو سہلایا جس پر امی نے کئی رات لال تیل کی مالش کی تھی۔ کپڑے کے کالے ٹوپے کو دیکھا جو جلاّد اس کو ٹھڈّی تک پہنائے گا۔

''جی ہاں''

اظہر نے جواب دیا۔ ''گھر میں میری الماری کے لاکر میں کالا دوپٹہ رکھا ہے اسے منگوا دیں۔ تاکہ گلے میں مفلر سا باندھ لوں''

☆☆☆

اُجلا اندھیرا

سنہری رنگ کی ڈبیہ دھنو کی کھردری انگلیوں میں دبی دیکھ منگلو نے سوکھے موٹے ہونٹوں پر زبان پھیری۔ اس کی مرجھائی آنکھوں میں حیرت کے سائے لہرا گئے۔ دھنو ہنس دیا اور لمبے ناخون سے ولایتی سگریٹ کے چمکتے پیکٹ کی باریک پنّی اتار پھینکی۔ ایک طرف سے اسے کھولا۔ سونے جیسا ننھا سا ورق گھسیٹا۔ پھر دودھ کی طرح سفید سگریٹ باہر کھینچی جو تاریکی میں منگلو کو کبوتر کا ٹوٹا پر دکھائی دی۔ سگریٹ اس نے پچاسیوں دیکھی تھیں، لیکن ایسی جھکا جھک دل کو للچانے والی جس کے تمباکو کی دھیمی دھیمی خوشبو اس کی ناک میں سرسراہٹ کر گئی۔ پہلے کبھی نظر میں نہیں آئی۔ پیلے کاغذ کے اندر روئی کا چھوٹا سا پھایہ تھا۔ منگلو کو اپنی پنڈلی کا وہ انچ بھر گہرا ناسور یاد آ گیا۔ جب شہر میں ڈاکٹر نے مرہم کو لمبی سی روئی میں گوندھ کے آہستہ آہستہ زخم میں گھسا دیا تھا۔ انگیٹھی پر رکھے پانی کی طرح اس کی رگوں میں سنسناہٹ پیدا ہوئی۔ دھنو نے اپنے دادا کی حیرانی دور کی۔ سگریٹ ہونٹوں میں دبا لی۔ دیا سلائی جلائی اور دھواں چھوڑتے ہوئے ایک قہقہہ لگایا۔ منگلو نے ولایتی پھلجھڑی کا کرتب دیکھا اور ہاتھ بڑھا کے دھنو سے سگریٹ لے لی۔ پھیپھڑوں میں جتنی طاقت تھی اسے یکجا کیا اور چلم جیسا بھرپور کش کھینچا۔ دھوئیں کے گاڑھے مرغولے کو کھانسی کے ٹھسکے نے پل بھر میں اِدھر اُدھر بکھیر دیا۔ اس نے بولنے کی کوشش کی تو آواز حلق میں الجھی گئی۔ تراوٹ کا احساس ضرور ہوا مگر کانوں میں بھونرے گنگنانے لگے۔ دور جنگل کی اندھیری پہاڑیوں سے بھوکے گیدڑوں کے چیخنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ گولر کے پتوں میں چمگادڑیں پھڑ پھڑانے لگیں۔ جھینگر بے تحاشہ بول رہے تھے۔

منگلو گونڈ جاتی کا فرد تھا۔ اسّی سال سے اوپر کی عمر ہو گی۔ دُبلا پتلا، سیاہ رنگ، بے نور

آنکھیں اور اچور سا سوکھا سُتا ہوا چہرہ۔ جبڑے پر کھال کی پتلی سی پرت جو ہڈیوں کو یوں ڈھانپے تھی جیسے گیہوں کی بالیاں دانے کو چھپائے رہتی ہیں۔ دھنو نے بتایا کہ بڑے باوا کے بیٹے ممتاز بھیا لندن سے ایسی ڈھیر ساری ڈبیائیں لائے ہیں۔ وہ اتوار کو گاؤں آئیں گے۔ کھیتوں میں چنے پک گئے ہیں۔ جی بھر کے بُوٹ کھائیں گے۔ انگریز میم صاحب سے بیاہ کیا ہے۔ لال سرخ ہیں۔ خرگوش جیسے سندر گول مٹول دو بیٹے ہیں۔ بڑے باوا نے کہلا بھیجا ہے کہ گھر آنگن کی خوب صفائی کرنی ہے۔ بھینسوں کے باڑے اور مرغیوں کے دڑبے میں ذرا بھی گندگی نہ رہے۔ باورچی خانے کی کالی دیواروں کو کھرچ کے سفیدی کرنا ہے۔ نئے برتن بھاڑے آئے ہیں۔ چائے پینے کے کپ ایسے چمچماتے ہیں جیسے ندی میں مچھلی۔ دھنو نے رام کی قسم کھاتے ہوئے بتایا کہ ان میں چائے پینا اپنا مقدر رہو تو ہونٹ سکڑ کے کٹورے سے چپک جائیں۔ ممتاز بھیا نے خوب نام اور دھن کمایا ہے۔

منگلو کی سگریٹ ختم ہوگئی۔ اس نے بچے ہوئے ٹکڑے سے پیلا کاغذ نوچا اور روئی کھینچ لی۔ ناک کے قریب لایا اور زور سے سونگھا۔ پھر دائیں کان میں ٹھونس لیا جیسے عطر میں ڈوبی ہوئی ہو۔

''جرا بھی مجا نہیں آیا''

اس نے ناگواری کا اظہار کیا۔ ''بیڑی پینے سے جان آجاتی ہے دھنو'' وہ پانچ سال کا تھا۔ بڑے بوڑھوں کو تمباکو بیڑی کا عادی دیکھا تو اسے بھی لت لگ گئی۔ دیسی تمباکو نے پچھتر سال تک اُس کے دل و دماغ پر راج کیا تھا۔ اب بھلا ممتاز بھیا کی سگریٹ اسے کیا خاک تسکین دیتی۔ چار کش لگا کے سمان دے دیا۔

بے شمار برساتی نالوں اور کچھ بڑے جھرنوں سے گھرے سینکڑوں ایکڑ زمین پر ہریالی اور حُسن برساتی کیرواں ندی کی شمالی گھاٹی کا احمد پور گاؤں میجر ابراہیم پٹھان، کا زراعتی، تعلقہ تھا۔ بلند پہاڑ اور سال ساگون کے درختوں کا طویل سلسلہ تین طرف گاؤں کا احاطہ کیے تھا۔ کیکر، آنولہ، مہوا اور گولر کی پھل پیداوار کا گونڈ لوگ بے فکری سے فائدہ اٹھاتے تھے۔ میجر ابراہیم کے

باپ دادا برسوں سے وہاں کھیتی باڑی کرتے آئے تھے۔ گاؤں گاؤں ان کی عزت اور دبدبہ تھا۔ رحم دل اور فیاض ہونے کی وجہ سے دیہاتی ہوں یا سرکاری ملازم، ہر کوئی انہیں بڑے باوا کے نام سے جانتا تھا۔ ان کے جد امجد، ۱۷۱۵ء میں صوبہ سرحد، کے پٹھان، سردار دوست محمد خاں کے ہمراہ سینٹرل انڈیا کے شہر بھیلسہ آئے اور وہاں کے حاکم کے ملازم ہوگئے تھے۔ قریب کے چھوٹے سے قلعہ منگل گڑھ کی راجپوت رانی کی بھی چاکری کی۔ جب دوست محمد خاں نے پرگنہ بیرسیہ بھوپال کی متاجری حاصل کی اس وقت بھی ابراہیم پٹھان کے مورث اعلیٰ ان کی فوج میں شامل تھے۔ پرانے وقت میں احمد پور میں گونڈوں کے دس بارہ گھر رہے ہونگے۔ پٹھانوں کی رحم دلی اور محبت نے پاس پڑوس کے گونڈوں کو بھی احمد پور کھینچ لائی۔ ایک دو ایکڑ کھیتی لایق زمین ہر گونڈ کی ملکیت ہوگئی ان کی عورتیں اور بچے پٹھان گھرانے کے کھیتوں میں کام کرتے تھے۔ منگلو اس خاندان کا سب سے بھروسے مند ملازم تھا۔

ممتاز بھیا دس سال کے رہے ہونگے اور منگلو ساٹھ کے اوپر اس وقت بھی وہ کالا تھا۔ ویسی ہی آنکھیں، ٹھگنا قد، غضب کا محنتی، ایماندار اور وفادار۔ کھیت کھلیان، مویشی اور فصلوں کا حساب کتاب، ان پڑھ ہوتے ہوئے بھی، دماغ میں بٹھائے رکھتا۔ ممتاز بھیا جب گاؤں آتے، ان کا ہاتھ تھام کر، کھیت کھیت گھماتا، جنگل اور جنگلی جانوروں، پرندوں کے درشن کراتا۔ ہرن اور چیتل کے جھنڈ چوکڑیاں بھرتے دیکھ ممتاز بھیا خود بھی اچھل کود کرتے۔ اسی طرح آتے جاتے ممتاز بھیا کو جنگل کے پتے پتے اور چوپایوں سے بے پناہ لگاؤ ہوگیا۔ گھر میں بندوقیں اور کارتوس کا بکس بھی تھا۔ لیکن بڑے باوا اور ممتاز بھیا نے زندگی بھر کسی چوپائے اور پرندے کا شکار نہیں کیا۔ گونڈ لوگ ہی تہوار پر جنگلی سور مار لیا کرتے ورنہ زیادہ تر جانور سونی کتوں کا نوالہ بنتے تھے۔ منگلو کے ہاتھ میں صرف لکڑی کے دستہ والی چھوٹی کلہاڑی، گھٹنے تک دھوتی، بنڈی اور کاندھے پر پچھورا اور سر پر مریٹھا، بندھا رہتا تھا۔ ہر موسم میں ایسا ہی لباس، نہ سردی کی چبھن اور گرمی کی تپش اس کے جسم اور مزاج پر کسی طرح کا اثر ڈالتی، اسے کسی کٹیلے جانور سے ڈر بھی نہیں لگتا تھا۔ خوف کھاتا تو صرف سانپ سے۔ گھر میں نکل آئے تو افراتفری مچ جاتی۔

منگو گونڈ نے ممتاز بھیا کو دن رات نہ صرف پیڑ پودے، جڑی بوٹی، کیڑے مکوڑوں اور بت نئے جانوروں کی عادتوں، چال چلن اور اچھائی برائی کے بارے میں اپنی موروثی معلومات سے آگاہ کیا بلکہ اپنے علاقے کی دلیر اور سندر رانی، کملاپتی کی داستان بھی سنائی تھی۔ ہزاروں میل مٹی میں سانس لیتی گونڈ روایات بغیر نمک مرچ لگائے اگل دی تھیں۔ ممتاز بھیا، دانتوں میں انگلیاں دبا لیتے۔ تین صدیاں بیت گئیں مگر آج بھی پرانے گونڈ اپنی رگوں میں سردار دوست محمد خاں، ان کے وارثین اور بیگمات کے احسانات، موجزن پاتے ہیں جو رہتی دنیا تک وہ بھلا نہ پائیں گے۔ شہر بھوپال سے جنوب میں ساٹھ کلومیٹر دور، مغلیہ عہد کا قلعہ گنور گڑھ، آباد تھا۔ اس کے تاریخی آثار آج بھی موجود ہیں۔ نظام شاہ گونڈ، وہاں کا بہادر اور طاقتور راجہ تھا۔ جس کی زندگی میں کسی سورما نے نگاہ اٹھا کے گنور گڑھ کو نہیں تاکا۔ اس کی تعلقہ داری میں ۷۵۰ گاؤں تھے۔ یہاں کے راجہ نظام شاہ کی سات رانیاں تھیں۔ ان میں کرپارام چندن گونڈ کی بیٹی کملاپتی بھی ایک تھی۔ بڑی دانا، خوبصورت اور فیاض۔ گنور گڑھ سے ستر میل کے فاصلے پر نظام شاہ کے بھتیجے، چین شاہ کی چین پور باڑی میں حکومت تھی، چین شاہ اور کچھ دوسرے گونڈ سرداروں نے سازش رچی اور زہر دیکر نظام شاہ کو ہلاک کر دیا۔ کملاپتی کی آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا۔ دھنو چار سگریٹیں پی چکا تھا۔ اس نے منگو سے پوچھا۔

''ایک اور پیو گے دادا'' دھنو خود بھی چالیس سال کا تھا۔ اس کے چاچا نے بتایا تھا کہ جنم کے وقت دھنو کی ماں پیڑا سے تڑپ رہی تھی۔ جھونپڑی سے دو سو گز دور تیندو کے پیڑ کے نیچے، بانس کے ڈھیلے ڈھالے پلنگ پر تکلیف سے ہاتھ پاؤں اس طرح پٹک رہی تھی کہ پلنگ کی چولیں، ٹوٹنے لگی تھیں۔ چیخ چیخ سارا جنگل سر پر اٹھا لیا تھا۔ بڑے باوا نے سنا اور فوراً جیپ بھیج دی کہ شہر کے زنانہ اسپتال لے جاؤ۔ لیکن منگو نے اپنی ماں کے ہاتھ میں گروڑ درخت کی سوکھی ٹہنی اور سانپ کی کینچولی تھمائی۔

''اُسے دکھا دے بس، سرہانے ہنسلی اور چاقو رکھ دے''۔ پھر کیا تھا۔ دو چار کمزور چیخوں کے بعد دھنو کا سر باہر نکل آیا۔ دھنو نے سگریٹ منگو کی طرف بڑھائی۔

''پی لو دادا۔ ممتاز بھیّا کی میم صاحب بھی پیتی ہیں''۔ منگلو سہم گیا بدن کا رُواں رُواں کھڑا ہو گیا۔ جسم میں پھریری دوڑ گئی۔ اس نے نفرت سے ہونٹ سکوڑے، اسے دُکھ ہوا کہ بڑے باوا اپنے دھرم کا بڑا سمان کرتے ہیں۔ گھر والیوں میں بھی لاج لجا ہے۔ سب روزہ نماز کے پابند، آنگن میں نماز پڑھتے تو وہ لاٹھی لے کر دائیں کونے میں کھڑا رہتا۔ سامنے سے بکرا بکری اور کتا نہ نکل پائے۔ آس پڑوس میں بچّوں کا شور وغُل تھم جاتا۔ بڑے باوا دائیں بائیں منہ پھیر لیتے تب آنگن میں چہل پہل شروع ہو جاتی۔ ان کی بہو سگریٹ پیے اور وہ برداشت کرلیں گے بھلا۔ انہوں نے جب پشتینی کچے ٹپر کو توڑ کے سیمنٹ اینٹ کا پکا مکان بنایا تھا۔ تب سفید داڑھی والے مولوی صاحب شہر سے آئے تھے۔ گھنٹہ بھر قرآن شریف پڑھا اور پھونک پھانک کے بنیاد کا پتھر رکھا تھا۔ گاؤں کے سارے مرد عورتیں اور بچے چھ مہینے کام پر لگے رہے۔ بڑے باوا نے چار بکرے صدقے کیے تھے۔ پورے گاؤں کی دعوت کی تھی۔

''رہنے دے'' منگلو نے دھنّو کو ڈانٹ دیا اور جھرّیوں سے گندھا ہاتھ ماتھے پر رکھتے ہوئے دھیمی آواز میں سمجھایا کہ گونڈوانہ کے واسیوں نے نہ کبھی کسی دھرم کی مخالفت کی اور نہ کسی کا پرچار۔ بس اپنے دیوی دیوتاؤں کے آگے جھکتے رہے۔ دھنّو نے جب پیکٹ کھولا تھا اس میں بیس سگریٹ تھیں۔ پرانی یادوں کا بکھان کرتے اب پانچ ہی بچی تھیں۔ منگلو کی پلکوں پر آنکھوں سے رِستا سفید چپ چپا غلیظ مادہ جم گیا تھا۔ ویسا ہی جو کانٹوں بھری ٹہنی سے گلاب توڑتے وقت پھول کی جڑ پر بوند کی شکل میں اُبھرتا ہے۔

''بڑے باوا جانیں اور ان کی بہو، ہماری تو جندگی کٹ گئی''۔ منگلو بولتے نہ تھکتا تھا۔ ممتاز بھیا بیس برس بعد احمد پور آئیں گے۔ وہ تصوّر میں انکے بچپن، لڑکپن اور ابھرتی جوانی کے پیچ وخم میں کھوتا گیا۔ دھنّو بھی بھول گیا کہ رات چڑھتی جارہی ہے۔

''دھیان رکھ دھنّو۔ ہم نے کھُلے آکاش کے نیچے جنم لیا ہے۔ ٹھاکر دیو گواہ ہیں''۔ دھنّو ہی کیا سارے ذات برادری والے گانٹھ میں باندھے تھے کہ ٹھاکر دیو نے جیسا نصیب بنا دیا۔ وہ پتھر کی لکیر ہے۔ ان مٹ ہے۔ دھن دولت اور شانتی، انکے لیے چاروں سمت رخ بدلتی تیز ہوا

سے زیادہ کچھ نہیں کہ بس محسوس کرلیا اور ڈھول جھٹک دی۔ ممتاز بھیا ولایت جانے سے پہلے آخری بار احمد پور آئے تھے۔ تب بڑے بڑے باوا نے منگلو کی عمر کو دیکھتے ہوئے اس کے پوتے دھنو کو نوکر رکھ لیا تھا۔ دوسری صبح ممتاز بھیا کو شہر واپس لوٹنا تھا۔ چاندنی رات تھی۔ وہ آنگن میں پلنگ پر لیٹے تھے۔ لکڑی کے اسٹول پر منگلو اور پائنتی کی طرف دھنو زمین پر اُکڑو بیٹھا تھا۔ احمد پور کے گونڈوں کو شہر کی ہوا ابھی نہ لگی تھی۔ وہ نہ اجودھیا جانتے تھے اور نہ ہی دھواں اُگلتی، خاک اُڑاتی اور انگارے برساتی رتھ گاڑی کی انہیں کوئی خبر تھی۔ ممتاز بھیا نے اتنا ضرور بتا دیا تھا کہ دیش بھر کے لوگوں میں غصہ اور نفرت ہے۔ چائے کے کئی کپ پینے کے بعد انہوں نے منگلو سے پوچھا۔

''نظام شاہ کو بھتیجے نے زہر دے دیا۔ پھر کیا ہوا؟'' منگلو نے پینترا بدلا اور گنور گڑھ کے کھنڈروں کی خاک چھاننے لگا۔ رانی کملا پتی دُکھ سے باؤلی ہوگئی۔ انتقام کی آگ میں جھلنے لگی۔ چین شاہ اور دوسرے دشمن اس کی چھاتی پر مونگ دلنے پر آمادہ تھے۔ رانی نے اپنے وزیر کو بیرسیہ پرگنہ روانہ کیا اور دوست محمد خاں سے مدد مانگی کہ اس کے شوہر کے قاتلوں سے بدلہ لیں۔ رانی نے ایک لاکھ روپیہ دینے کا وعدہ کیا۔ دوست محمد خاں نے چین پور باڑی پر حملہ کر دیا اور چُن چُن کر رانی کے دشمنوں کو موت کے گھاٹ اُتارا۔ منگلو نے بڑے فخر سے بتایا کہ اس جنگ میں بڑے باوا کے پردادا بھی شریک تھے۔ فتح پانے پر رانی کملا پتی نے سردار صاحب کو پچاس ہزار نقد دیئے اور باقی رقم کے عوض میں جنگلوں کا بڑا علاقہ دیدیا۔ جہاں سردار صاحب نے بھوپال شہر بسایا۔ احمد پور سے واپس ہوتے وقت ممتاز بھیا نے منگلو اور دھنو کو رتھ گاڑی کی ہولناکی سے آگاہ کیا۔ آنکھیں اور کان کھُلا رکھنے کی ہدایت بھی دی۔ منگلو نے ہمیشہ کی طرح محبت اور وفاداری کا وشواس دلایا۔

''بھیاجی۔ ناکھُن انگلیوں سے کبھی الگ نہ ہووے گا''

دیوالی سے دو دن پہلے تین تلک دھاری سادھو احمد پور آئے۔ جھونپڑیوں اور ابراہیم پٹھان کے مکان سے کافی دور میدان میں اونچے بانس پر جھنڈا لہرایا۔ ہر گونڈ کو اطلاع دی کہ لکشمی پوجن کا سمارو دو دن چلے گا۔ سب اس میں بھاگ لیں اور پُن کمائیں۔ منگلو اچمبھے میں تھا۔ اس نے اپنے جیون میں پہلے ایسا تماشہ نہ دیکھا نہ سنا تھا۔ پوجا پاٹھ سے گھر بیٹھے دھن دولت، ہاتھ آتی

ہوتو گاؤں دیہات، جسم پر پھٹے پرانے کپڑے، مٹی کے برتن، خالی پیٹ اور گھر گھر کا اندھیرا پل بھر میں چھٹ جاتا۔ دیر رات گئے وہ گھومتا ہوا سادھوؤں کے ٹھکانے جا پہنچا۔ سادھو دن بھر میں جان چکے تھے کہ منگلو احمد پور اور آس پڑوس کے گونڈوں میں سب سے زیادہ سیانا اور اثر دار آدمی ہے۔ ایک بوڑھا سادھو اپنی جگہ سے اُٹھا اور منگلو کو پیپل کے نیچے لے گیا۔

''بیٹھو مہاشے۔ آج بڑے پوِتر سمے پر آئے ہو''۔ سادھو نے کچھ دیر احمد پور میں رہنے والی جن جاتی کی غربت، بربادی اور بھکمری پر افسوس جتایا۔ صدیوں سے دو وقت کی روٹی کے لیے پسینہ بہانے اور جیب میں دمڑی نہ ہونے کا رونا رویا۔ آنسو بہائے اور تیکھے لہجے میں پوچھا۔

''یہاں کھیتی کی زمین کتنی ہے اور کون مالک ہے''؟۔

''بابا۔ احمد پور کی ساری زمین بڑے باوا کی ہے''۔ منگلو نے جواب دیا۔

''کون بڑے باوا؟''

''ابراہیم پٹھان۔ ان کے پردادا نے ہمری کملا پتی رانی کے دشمنوں کو مارا تھا''۔

سادھو نے ناک بھوں چڑھائی اور چلم پیتے ہوئے کہا۔

''بس بس۔ دیکھ منگلو آج تجھے غریبی اور غلامی دور کرنے کا گرو منتر بتائے دیتا ہوں''۔

اس نے منتر کے ورق کھولے۔

''یجروید میں بھگوان وشنو نے کہا ہے کہ جس گھر میں دیوالی کی رات بھینس کے شُدھ گھی کا ہون کیا جاتا ہے۔ اس گھر میں لکشمی سمیت خود نواس کرتا ہوں''۔ سادھو نے ہون اور پوجا پاٹھ کے طریقے سمجھائے''

دوسری صبح منگلو خوشی خوشی وہاں پہنچا تھا کہ رات کو وہ ہون کرے گا اور سادھو مہاراج کے آشیرواد سے اُس کی جھونپڑی میں لکشمی سونے کی تھال میں اشرفیاں لیے کھڑی ہوگی۔ گونڈوں کو شکتی ملے گی اور غریبی سے نجات بھی۔ آج کے بعد احمد پور کی گربھ وتی مہیلائیں

درختوں کے نیچے بچّوں کو جنم نہیں دیں گی۔ وہ بیڑی چھینک سنہری پیکٹ والی سگریٹ پیے گا۔ دھنو جنگلی سور کے بجائے بندوق سے شیر مارے گا۔ سیمنٹ اور اینٹ کے مکان ہوں گے۔ مگر میدان میں سناٹا تھا۔ تینوں سنت سادھو اپنا ڈیرا اور ترشول اٹھا کر احمد پور سے جا چکے تھے۔ منگلو کی نگاہیں ان تین گہرے گڑھوں پر جم گئیں جہاں سادھوں نے ترشول گاڑے تھے۔ وہاں لال چیونٹوں کا اژدہام تھا۔ خالص گھی میں تلی ہوئی پوریوں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں پر ہزاروں چیونٹے ٹوٹ پڑے تھے۔

منگلو سر جھکائے لوٹ آیا۔ اسے بےچینی سے رات کا انتظار تھا۔ شام کو بڑے باوا کے مکان پر گیا۔ اسٹور کی چابی اسی کے پاس رہتی تھی۔ تالا کھول اندر گیا اور گھی کے کنستر کے پاس رُک گیا۔ ڈھکن کھولا اور ہاتھ میں تھامی دیگچی منہ تک لبالب بھر لی۔ باہر آ کے تالا لگا دیا اور اپنی جھونپڑی تک جانے سے پہلے ندی میں ڈبکی لگائی۔ گھر آیا اور گوبر سے فرش کی لپائی کی۔ ہلدی پانی بھرے کٹورے میں گھول کے چھڑکاؤ کیا۔ گاؤں کا اوجھا اور رشتہ دار بھی صاف ستھرے کپڑے پہن کے آ بیٹھے۔ آدھی رات ہونے سے پہلے ہَون میں آگ بھڑکی اور ابراہیم پٹھان کی بھینسوں کا شدھ گھی چنگاریاں اُچھالنے لگا۔ اوجھا گونڈی بھاشا میں کچھ بُدبُدا رہا تھا۔ گھنٹہ بھر کے بعد منگلو اپنے جیون میں پہلی بار دھارمک اونچ نیچ میں غوطہ لگانے کے بعد مہوے کی آدھی بوتل حلق سے اتار کر لیٹ گیا۔

دو ماہ بیت گئے۔ منگو کی جھونپڑی میں نہ وشنو بھگوان اور نہ ہی لکشمی کی جگمگاہٹ کے آثار پیدا ہوئے۔ اتوار کا دن تھا۔ رتن پٹواری، موٹر سائیکل پر شہر جانے کے لئے گھر سے باہر آیا تو اس کی نظر منگلو کی طرف اٹھی۔ جو بڑے ڈرامائی انداز میں وہاں کھڑا ہوا سگریٹ پی رہا تھا۔ رتن پوچھ بیٹھا۔

"کہاں سے آ گئی سگریٹ؟"۔ منگلو نے جیب سے سنہری پیکٹ نکال کے رتن کی طرف بڑھایا۔

"لو۔ تم بھی لو۔ ممتاز بھیا ڈھیر سارے دے گئے تھے"۔

رتن مسکرادیا۔ اُس نے منگلو کو شہر جانے کے لیے راضی کرلیا۔ ہَوا کا سینہ چیرتی موٹر سائیکل احمد پور سے دس کلومیٹر دور رانی نگر گاؤں پہنچی۔ سڑک کے کنارے منگلو نے بانس کا اونچا جھنڈا دیکھ رتن کو روک دیا۔ وہ جھجلایا ہوا تھا اور گرومنتر بتانے والے سادھوؤں کو دور سے ہی گھورتا ہوا موٹر سائیکل سے اُتر گیا۔ ان کے قریب پہنچا اور کٹکھنے لہجہ میں بولا۔

''مہاراج خالص گھی کا ہَون بھی کیا۔ مگر کچھ بھی نہ ہوا۔''

''گھی شُدھ نہ ہوگا منگلو۔ کہاں سے لائے تھے''

''اصلی تھا۔ رتّی برابر ملاوٹ نہیں۔ جانتے ہو بڑے باوا کے گھر کا گھی تھا''۔ منگلو نے کھوکھلی چھاتی ٹھوکتے ہوئے جواب دیا۔ سادھو کی آنکھیں سرخ ہوگئیں۔ غصے سے تمتما گیا۔ اُس نے زمین پر تھوکا اور منہ ٹیڑھا کر کے بولا۔

''ارے مورکھ سارا ہَون بھرشٹ کردیا۔ ستیاناس ہوجائے۔
مرتیو تک یوں ہی نِردھن، دُربل اور غلام رہو گے''۔

☆☆☆

اُڑن چھو

ساٹھ سالہ حکیم حمید چھوٹے شہر کا ایسا واحد شخص تھا جس نے پہلی بار ڈامر والی سڑک کنارے نیم کے پیڑ تلے چنّی خالہ کو کھڑا دیکھا تھا۔ سر سے پیر تک وہ بُت کی طرح نظر آ رہی تھیں۔ دِلکش سنگ تراشی اور حسین و جمیل نقش و نگار والا بُت جسے جنونی ہتھوڑے نے کئی جگہ سے چھلنی کر دیا ہو۔ حکیم حمید نیم پر پھول آنے کے موسم میں سورج نکلنے سے پہلے زمین پر بکھرے شبنم میں بھیگے ہوئے پھولوں کو اکٹھا کرنے آتا تھا۔ جن سے وہ کھاج کھُجلی کے مریضوں کے لیے سفوف تیار کیا کرتا تھا۔

اس وقت چنی خالہ مشکل سے بیس برس کی ہونگی۔ کمر تک لمبے سیاہ بکھرے بال جو لال گالوں پر ہَوا میں بَل کھا رہے تھے، گُلابی رنگ، کتابی چہرہ، ناک میں پیتل کی لونگ جس میں سفید نگ جڑا تھا، معصوم انکھڑیوں پر ہرنی جیسی نازک پلکیں، خاکی شرٹ اور ویسا ہی نیکر پہنے تھیں۔

بیتی شام ہی ضلع ہیڈ کوارٹر کی حدود سے کرفیو اٹھا تھا۔ جہاں دس دن خون خرابہ ہوا تھا۔ حکیم حمید کا ماتھا ٹھنکا۔ وہ اونچی آواز میں صرف اتنا کہہ رہی تھیں۔ ''اُڑن چھو۔ اُڑن چھو'' ایک ہاتھ میں چھوٹی سی لکڑی تھی۔ بید کی چھڑی جیسی جو پولس افسر بغل میں دابے رہتے ہیں۔ دوسرے ہاتھ میں کپڑے کا تھیلہ جس میں نہ جانے کیا الّم غلّم بھرا تھا۔ مکھن سی سفید پنڈلیاں اور قصائی کی دوکان پر ٹنگی فربہ بکرے جیسی موٹی رانیں جس پر مکھیاں بھی بیٹھنے میں شرمائیں۔ خاکی شرٹ طوطا پری آم کی طرح سخت چھاتیوں کو پناہ دینے سے تنگ آ چکی تھی کہ ناف سے اوپر تک اٹھی ہوئی تھی۔

چُنّی خالہ کا حلیہ اور خوبصورتی دیکھ حکیم حمید کو کچھ لمحے کے لیے سکتہ سا ہوگیا۔ مبہوت ہوکر ہوسناک نگاہوں سے انہیں تاکنے لگا۔ بڑی مشکل سے اپنے آپ پر قابو پایا۔ سر کو جھٹکا دیا۔ دماغ سے خرافاتی خیال کو باہر کیا اور کڑوے نیم کی چھاؤں میں اُس کی مٹھاس بھری آواز ہونٹوں سے پھسل پڑی۔

''ارے بیٹی۔ یہاں اکیلی کیوں کھڑی ہو۔ کسی کے گھر جانا ہے؟''

چُنّی خالہ نے پلکیں اٹھائیں۔ سورج کی نقاب اُٹھ چکی تھی۔ آنکھوں میں درد کی ہلکی دھاری لہرائی اور وہ اونچی آواز میں بولیں۔

''اُڑن چُھو۔ اُڑن چھو۔ جن سیوا۔ لیفٹ رائٹ'' حکیم حمید نے حیرت سے کان میں انگلی گھمائی جیسے اسے چُنّی خالہ کے عجیب وغریب الفاظ سنائی نہ دیئے ہوں۔ ملائم نازک ہونٹوں سے سپاہیانہ کڑک شبدوں نے اسے بوکھلا دیا۔ اُس نے نیم کے سفید اور نیلگوں پھولوں کو نگاہیں نیچی کیے دیکھا اور ہمت جٹا کر دوبارہ پوچھا۔

''تم کون ہو بیٹی۔ کہاں سے آئی ہو۔ کس کی تلاش ہے۔ مجھے پتہ بتاؤ۔ وہاں چھوڑ بھی آؤں گا''

چُنّی خالہ نے بغل میں دبی چھڑی ہاتھ میں سنبھالی اور سر سے اوپر بلند کر کے چیخیں۔

''اُڑن چھو۔ پیچھے مُڑ۔ تیز چل۔''

اب حکیم حمید نے وہاں سے کِھسک لینا ہی مناسب سمجھا اور کھاج کھجلی کے سفوف کو بھول تیزی سے پھولوں کو روندتے ہوئے اپنے گھر کی طرف چل دیا۔ اتنا ضرور کہتا گیا کہ وہ حکیم حمید ہے۔ سارا شہر جانتا ہے۔ کسی مدد کی ضرورت ہو تو چلی آنا۔ اُس دن صبح سے شام تک حکیم حمید گُم صُم رہا۔ مریضوں سے بھی معمول کی طرح ہنس بول کر بیماری کی جانچ پرکھ نہیں کی۔ کانوں میں لیفٹ رائٹ اور آنکھوں میں چُنّی خالہ پتنگے جیسی رقص کرتی رہیں۔ اسی ادھیڑبُن میں وہ باہر آیا تو ہر ایک زبان پر چُنّی خالہ کی چرچا تھا۔ ایک

ہی دن میں دس کلومیٹر رقبے میں پھیلے انوپ نگر کی سڑکوں اور گلی کوچے میں اُن کی اُڑن چھو اور لیفٹ رائٹ نے دھوم مچا دی۔ کچی عمر کے بچوں کی دھما چوکڑی نے اسکول اور پاٹھ شالائیں سونی کر دیں۔ اس سب کے چلتے چُنّی خالہ کا چہرہ ہمیشہ جذبات سے عاری رہا۔

اس دن کے بعد سے چُنّی خالہ کسی کے لئے اجنبی نہیں رہیں۔ حکیم حمید صرف یہ چاہتا تھا کہ چُنّی خالہ کو کسی طرح اپنے مطب کی طرف راغب کر لے۔ اُس کے پاس زہر مہرہ کا ایسا نایاب نسخہ تھا جو دماغی امراض میں کارگر ثابت ہو چکا تھا۔ اس کا مقصد یہ بھی تھا کہ نبض دیکھ کر خالہ کا مرض تشخیص کیا جا سکے۔ اسے اپنے خاندانی مجرب نسخوں کی قلمی کتاب پر پورا بھروسہ تھا۔ حالانکہ وہ سند یافتہ طبیب نہیں تھا۔ صرف وہی خود جانتا تھا کہ ممبئی میں بھنڈی بازار کے ایک نامور حکیم کے دواخانے میں کمپونڈر رہتے کئی آزمودہ نسخے اپنی ڈائری میں نقل کر لیا کرتا تھا۔ کئی سال اُس نے اسی حکمت عملی پر عمل کیا اور کافی سوچ وچار کے بعد وہ اپنے دو بیٹوں اور بیوی کو مائکہ میں چھوڑ کے انوپ نگر میں حکیم حمید بن بیٹھا۔ چھوٹی سی دوکان نے کچھ ہی برس میں چمتکار دکھایا۔ دو ڈاکٹر والی سرکاری ڈسپنسری پر ویرانی چھا گئی۔ اور انوپ نگر میں حکیم حمید کا سکہ جم گیا۔ دور قریب کے دیہات سے مریض آنے لگے۔ تین کمروں کا مکان بھی بنا لیا۔ اپنی بیوی کو بلا لیا۔ بیٹے تعلیم کی خاطر ننھیال میں رُک گئے۔

حکیم حمید صبح نماز کے لیے اٹھتا تو پہلی صدا چُنّی خالہ کی سنائی دیتی۔ جو سر سے پاؤں تک اسے لرزا دیتی۔ ''اڑن چھو۔ اڑن چھو'' چُنّی خالہ کا انداز اور پیروں کی دھمک کسی تربیت یافتہ سپاہی سے کم نہ تھی۔ وہ انہیں دیکھتا تو اسے پرانے دن یاد آجاتے جب بمبئی میں سویرے پربھات پھیری نکلتی تھی۔ تیس چالیس مرد اور عورتیں ہاتھوں میں ترنگا جھنڈا لیے ''رگھوپتی راگھو راجہ رام'' گاتے محلے محلے گھومتے تھے۔ وہ تب سات سال کا تھا اور اسے یہ نغمہ اور دھن بہت پسند تھی۔ اس میں غضب کا رس اور کشش

تھی ۔ امن اور بھائی چارے کا پیغام تھا۔ جوان ہوا تو دھن نے پھر کبھی سویرا نہیں دیکھا۔اب ۷۰ برس کی عمر میں ''اڑن چھو'' نے ایک بار پھراُس کے دماغ میں رام دھن کی یاد انگڑائی لے اٹھی ۔ وہ کھڑکی سے چُنّی خالہ کو آتے جاتے دیکھتا ۔اُن کی آواز میں درد کی ٹیس ہوتی ، بیچارگی اور مایوسی کی فریاد ہوتی ۔انجانے ظلم وستم اور نفرت کے خلاف دبی دبی چیتاوَنی ۔خبردار کرنے اور بیدار رہنے کی گرج تھی ۔مگر حکیم حمید بھنڈی بازار کے آزمودہ نسخوں کی بیاض پلٹتے پلٹتے ناکام ہوگیا۔اور خالہ کا کوئی حل نہ ڈھونڈ سکا۔

چُنّی خالہ نے کبھی کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلایا۔وہ سامنے آتیں تو ہر کسی کا ہاتھ جادوئی انداز میں جیبوں میں جاتا اور نوٹ اُن کی طرف برس پڑتے ۔چلچلاتی دھوپ اور خون جما دینے والی برفیلی ٹھنڈ میں بھی وہ آرام سے گھومتی پھرتیں ۔صرف بارش کے موسم میں وہ نظر نہیں آتیں ۔خالہ کی ایک عادت نے سب کو اچنبھے میں ڈال دیا تھا۔کوڑا کرکٹ کا ڈھیر ہو یا راستے میں ادھر اُدھر جہاں تہاں بچّوں کے پھٹے پرانے جوتے انہیں دکھائی دیتے وہ چیل کی طرح جھپٹ پڑتیں اور خوشی خوشی تھیلے میں ڈال لیتیں ۔ پھر ہوتا یوں کہ انہیں بچّوں کی تلاش ہوتی ۔اگر نگاہ میں کوئی آتا تو جوتا پہنانے میں مصروف ہو جاتیں ۔لیکن ان کی پوشیدہ دلی مراد پوری نہیں ہوتی اور پھر تھیلے میں واپس ڈال لیا کرتیں ۔

ان کا نام بھی یوں معلوم ہوا کہ مڈل اسکول کے دروازے پر کھڑی تھیں ۔ دو پہر لنچ کا گھنٹہ بجا۔لڑکے لڑکیاں باہر دوڑے آئے اور خوانچے والوں کو گھیر لیا۔ایک بچی ان کے پاس آئی اور مٹھی میں سے ایک چاکلیٹ نکال کر اُن کی طرف بڑھائی ۔

''لو کھالو۔میٹھی ہے اس میں دودھ بھی ہے''

انہوں نے مسکرا کے چاکلیٹ اٹھالی۔آنکھوں میں آنسو آگئے ۔جیسے کچھ یاد آگیا۔تبھی بچّی بولی ۔

''ہے نا میٹھی؟۔ تمھارا نام کیا ہے؟

''چُنّی! وہ سب چُنّی پکارتے تھے۔''

''میں تمہیں چُنّی خالہ کہا کرونگی۔ یہاں آتی رہنا۔'' بچّی نے اتنا کہا اور اندر چلی گئی۔ پھر یہ ہوا کہ ہر چھوٹا بڑا انہیں چُنّی خالہ کہنے لگا۔

بھلا ہو لکڑی کے ٹال والے گردھاری لال کا۔ لمبے چوڑے طویلے کے شمالی کونے میں پرانا تخت پڑا تھا۔ دو پائے ٹوٹ چکے تھے۔ اینٹوں کا سہارا دیکر اس پر مکو کاسنی کی سوکھی گڈیوں کا ڈھیر لگا رکھا۔ حکیم حمید عورتوں کے امراض کے لیے خاص مرہم تیار کرتا تب خرید لیا کرتا تھا۔ گردھاری لال بال بچّوں والا سیدھا اور خاموش مزاج کا آدمی تھا۔ ساٹھ سال کی دھوپ چھاؤں میں دن گذارے تھے۔ پوجا پاٹھ پابندی سے کرتا اور سوتے جاگتے دل میں بھگوان کا خوف جگائے رکھتا۔ ماتا پتا اور راکھی باندھنے والی دو جوان بیٹیوں کو اپنے ٹال کی لکڑیوں کی چتا میں جلایا تھا۔ اسی لیے دھرم کرم کے کام میں پہل کرنے کی عادت تھی۔

''چُنّی بائی۔ تھیلہ یہیں رکھ دے اور وہاں تخت پر سو جایا کر''

گردھاری لال نے اشارہ کرتے ہوئے چُنّی خالہ سے کہا۔ ''اس طویلے کو اپنا ٹھکانہ سمجھ اور بے فکری سے رہ لے''

انہیں گردھاری لال کے طویلے میں مہینہ بھر ہوا تھا کہ پولس کے تین سپاہی ٹال پر آدھمکے اور بتایا کہ لڑکی کو تھانیدار صاحب نے تھانہ میں طلب کیا ہے۔ وہ چیخی چلائی ہاتھ پاؤں مارے مگر سپاہیوں کو حکم کی تعمیل کرنی تھی۔ انہوں نے خالہ کو لاٹھیوں کے گھیرے میں لیکر آگے چلنے کا اشارہ کیا۔

''داروغہ جی۔ دیوانی ہے بے سہارا دُکھیاری ہے۔

کسی کو کچھ نہیں کہتی۔ نہ بھیک مانگے نہ پتھر مارے'' گردھاری لال ہاتھ جوڑ کر گڑگڑایا۔ ایک سپاہی نے اسے دھتکار دیا۔

''چپ رہو۔ جانچ کرنی ہو گی تھانیدار صاحب کو۔ پوچھ تاچھ ضروری ہے۔ دشمن کی جاسوس ہو سکتی ہے''۔

چُنّی خالہ کو پولس کے پہرہ میں ضلع شہر لے جایا گیا۔ نیورو فزشین نے گھنٹہ بھر جانچ کے بعد رپورٹ لکھ دی کہ کسی حادثہ میں لڑکی کی یادداشت چلی گئی ہے۔ دو سپاہی اور جیپ ڈرائیور دیر رات چُنّی خالہ کو ٹال کے پاس چھوڑ گئے۔ وہ لڑکھڑاتی گردھاری لال کے کمرہ کے نزدیک سے گزری تو گردھاری لال نے اسے ٹوکتے ہوئے کہا۔

''جا بیٹی کھانا کھالے۔ اندر ٹفن رکھا ہے''۔ خالہ نے پتھرائی آنکھوں سے گردھاری لال کو دیکھا۔ اُن کے ہونٹ کچھ کہنے کو کھلے لیکن سپاہیوں کے منہ سے نکلی بدبودار چپچپاہٹ نے اچانک ہونٹ سی دیئے۔ انہوں نے ایک ہاتھ سے کئی بار پیٹ تھپتھپایا۔ جیسے کہہ رہی ہوں کہ پیٹ خوب بھرا ہوا ہے۔ گردھاری لال زمانہ کی اونچ نیچ سے واقف تھا۔ وہ بھانپ گیا جب نشہ بھرپور جوانی پر باز بن کر جھپٹتا ہے تو وہ لاچار بیر بہوٹی جیسے سکڑ کے رہ جاتی ہے۔ کوئی بھنبھناہٹ نہیں ہوتی۔ پھونک مارو پھسل جائے۔ چُنّی خالہ کے بکھرے بال، گالوں پر ناخن کا کھلواڑ، نیکر پر ہوسنا کی کے کلف کی طرح بدنما داغ، ٹی شرٹ کے اوپری حصہ پر دانتوں کی غلیظ نمی اور آنکھوں میں خوف ہراس آپ بیتی سنا رہے تھے۔ گردھاری لال کو محسوس ہوا جیسے ٹال میں رکھی موٹی پتلی لکڑیاں اژدہے کی طرح دھیرے دھیرے رینگ رہی ہوں۔ چُنّی خالہ نڈھال قدموں سے اُڑن چھو اُڑن چھو کہتی تخت کی طرف چلی گئیں۔ رندھی آواز میں گردھاری لال بڑبڑا کے رہ گیا کہ اے ایشور اس کلجگ کا انت کب اور کیسے ہوگا۔

پولس کے سپاہی ہوں یا انوپ نگر کے لچے لفنگے، چُنّی خالہ کسی سبزی فروش کے ہاتھ ٹھیلے پر رکھی گاجر مولی بنکر رہ گئیں کہ راہ چلتے سانڈ منہ پھاڑ اٹھانے لگے۔ اُن کی عصمت حاتم طائی کی سخاوت کی طرح دونوں ہاتھوں سے لٹتی گئی۔ لوگ حیران تھے کہ یہ سب کچھ ہوئے کئی سال نکل گئے لیکن خالہ کا پیٹ نہیں پھولا۔ سیانی بوڑھی عورتیں کہتیں

چتی خالہ کی بچہ دانی بنجر کھیت ہے۔ لاکھ کھاد ڈالو بیج پھوٹنے سے رہا۔ حکیم حمید کی سوچ میں بھی تبدیلی آئی۔ اُس نے کچھ سمجھ دار بزرگوں کو تھانیدار سے ملنے کا اور درخواست دینے کا مشورہ دیا۔ چتی خالہ کو ضلع کے پاگل خانہ میں داخل کیا جائے تاکہ قصبہ میں بدکاریاں روکی جاسکیں۔ مگر گردھاری لال نے بڑھ چڑھ کر مخالفت کی۔ اس کی دلیل تھی کہ چتی خالہ کو انوپ نگر نے برسوں پہلے پناہ دی۔ وہ اس کے طویلے کا اٹوٹ انگ ہیں۔ سڑکوں پر بے شمار کتے کتیاں آوارہ بھونکتے پھرتے ہیں۔ اُن میں بہت سے خارش زدہ ہیں۔ بیماریاں پھیلاتے ہیں۔ کتنے راہ گیروں کو کاٹ چکے ہیں۔ انہیں کوئی کچھ نہیں کہتا۔ ان کو بھی شہر سے نکال کر دکھاؤ۔ ادھر ہفتہ بھر بیمار رہ کر گردھاری لال دنیا سے رخصت ہوا اُدھر چتی خالہ کی دردناک چیخوں نے آسمان ہلا دیا۔ وہ ٹال سے سڑک پر آگئیں۔ سر کے بال نوچتی گھر گھر دروازہ پر رکتیں اور گلا پھاڑ کے آواز دیتیں۔ ''اڑن چھو۔ اڑن چھو''۔ بھاگتی دوڑتی وہ بڑے بازار کے اُس نیم تلے آکے بیٹھ گئیں جہاں بیس سال پہلے آئی تھیں۔ دو دن بھوکی پیاسی تنے سے پیٹھ لگائے آنسو بہاتی رہیں۔ حکیم حمید اُن کے جذبات کو پڑھنے کی فراغ میں وہاں چار مرتبہ گیا۔ یقین دلایا کہ وہ اکیلی نہیں۔ انوپ نگر کا ہر فرد اُن کے ساتھ ہے۔ گردھاری لال نے جس طرح اُن کا خیال رکھا، پناہ دی اور ہمدردی جتائی ویسا ہی گردھاری کا بیٹا مانگی لال بھی کرے گا۔ گردھاری لال کی تیرھویں ہو جانے کے بعد ہی چتی خالہ نے نیم کا سایہ چھوڑا اور طویلے لوٹ آئیں۔

اب خالہ کے ہاتھ میں لاٹھی آگئی۔ مردوں کی مردانگی نے اُن کے جسم کو کھوکھلا کر دیا تھا۔ چہرہ اور گردن پر جھریوں کا جال بچھ گیا تھا۔ پنڈلی اور رانوں کی آب و تاب ماند پڑ گئی۔ پھٹی ٹی شرٹ ناف کے نیچے آگئی۔ بالوں میں چاندی کے تار سے اُبھر آئے۔ آواز اتنی کمزور ہوگئی کہ ''اڑن چھو۔ اُڑن چھو'' اتنی آہستگی سے کہتیں مانو پھونک مار رہی ہوں۔ سڑکوں پر گھومنا کم کر دیا تھا۔ کبھی لاٹھی کے سہارے نکلتیں تو

جگہ جگہ ستانے بیٹھ جاتیں۔ ایک صبح حکیم حمید اتوار کی صبح گھر سے چہل قدمی کرنے باہر آیا۔ مانگی لال کی ٹال کے سامنے پہنچا تب لاٹھی ٹیکتی خالہ بھی گیٹ کے پاس آتی دکھائی دیں۔ وہ رُک گیا۔ سورج کی ہلکی ہلکی روشنی پھیلنے کو تھی۔ اس نے سوچا چہل پہل نہیں ہے۔ بات کرنے کا اچھا موقع ہے وہ اُن کے قریب آیا اور دھیرے سے بولا۔

''خالہ۔ ذرا سُنو۔ دیکھو تمہیں دیکھتے دیکھتے میں۔ بوڑھا ہو گیا۔ نہ جانے کب آخری سانس نکل جائے۔ ایک بات بتاؤ گی''!

خالہ نے لاٹھی زمین پر ماری اور ہنس کر بولیں۔

''مجھ میں ابھی جان ہے۔ بڑھاپے میں تم بھی زور آزمائی کرلو۔ اتاروں کپڑے''؟

حکیم حمید نے انہیں مسکراتے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اُسے حیرانی کے ساتھ خوشی بھی ہوئی کہ آج اُن سے سب راز اُگلوا لے گا۔

''توبہ توبہ کیا کفر بکتی ہو۔ ابھی نماز پڑھ کے آیا ہوں''!

وہ سٹپٹا گیا اور سوچا وقت کے دھارے نے چتّی خالہ کو بری طرح توڑ کے رکھ دیا ہے۔ نہ جانے کس کی آنکھ کا نور رہی ہونگی۔ کتنے ظلم سہے ہونگے۔ کیسا خوفناک طوفان ہوگا جس نے تنکے کی طرح اپنوں سے دور انہیں انوپ نگر میں لا پھینکا۔

''پوچھو کیا پوچھنا ہے''! خالہ کا لہجہ نرم تھا۔

''تم کہاں سے آئی ہو۔ کون ہو۔ کیا نام ہے''؟ حکیم حمید نے ایک ہی سانس میں کئی سوال کرڈالے۔ چتّی خالہ نے قہقہہ لگایا۔ اور آگے بڑھ گئیں۔

''اُڑن چھو۔ لیفٹ رائٹ'' حکیم حمید ہمیشہ کی طرح خالہ کی پہیلی نہ بوجھ سکا اور مایوس نظروں سے انہیں دیکھتا رہا۔

دسہرے سے ایک دن پہلے حکیم حمید بڑے بازار سے گذر رہا تھا۔ تہوار کی وجہ سے دیہات سے بَیل گاڑیوں میں لوگوں کے آنے سے سڑک پر کافی بھیڑ تھی۔ تبھی اس

کے کانوں میں چُنّی خالہ کی آواز گونجی۔

''اڑن چھو۔'' وہ جوتوں کی دوکان کے قریب ٹھٹھک کے رُک گیا۔ آج اُن کی آواز میں توانائی تھی۔ ہجوم میں بڑے تو کیا بچے بھی خالہ کو مداری کی بندریا سمجھ کر مزے، لے رہے تھے۔ اچانک چُنّی خالہ لاٹھی سے لوگوں کو ڈراتی دھمکاتی تیزی سے اُدھر کو لپکیں۔ شیشے کے شوکیس میں رکھے بچّوں کے چمچماتے جوتوں کو ایک لڑکا بڑی حسرت سے تک رہا تھا۔ وہ لڑکے کی پشت پر آ کھڑی ہوئیں جو بُد بُدا رہا تھا۔

''سیتارام جی میں آئیں گے۔ اے بھگوان یہ کالا چمکیلا!

جوتا مجھے دیدے۔ انہیں پہن کر دسہرہ میدان جاؤں گا''

چُنّی خالہ لڑکے کے سامنے آ گئیں۔ اس کا ہاتھ پکڑا اور دوکان میں گُھس گئیں۔ حکیم حمید آنکھیں پھاڑے یہ نظارہ دیکھ رہا تھا۔ دوکاندار نے دونوں کا حلیہ دیکھ کر ناک بھوں چڑھا لیں۔ وہ کچھ بولتا اس سے پہلے چُنّی خالہ نے نیکر کی دونوں جیب سے مُڑے تڑے دس دس کے نوٹ نکالے اور کاؤنٹر پر ڈھیر لگا دیا۔ لاٹھی سے شوکیس میں رکھے کالے جوتے کی طرف اشارہ کیا جس پر لڑکے کی نگاہیں ابھی بھی جمی ہوئی تھیں۔

''اس کے ناپ کا نکال کر پہناؤ'' اُن کی آواز ریشم کے گولے طرح شوکیس کو چھوتی حکیم حمید کے کانوں سے ٹکرائی جو باہر دم بخود کھڑا تھا۔ جوتے کی جوڑی ایک ہاتھ میں لیے اور دوسرے ہاتھ سے لڑکے کو گھسیٹتی وہ سڑک کنارے پانی کے نل پر آئیں۔ جوتے زمین پر رکھ دیئے اور نل کھول کر پوری طاقت سے لڑکے کے پاؤں رگڑنے لگیں۔ اچھی طرح میل صاف کیا۔ جھٹ اپنی ٹی شرٹ اتاری اور پیر سکھائے۔ اُن کی چھاتیاں بھینس کے ایسے تھن جیسی لٹکی ہوئی تھیں جن میں سے گوالے نے سارا دودھ نچوڑ لیا ہو۔ بڑے پیار سے لڑکے کو جوتے پہنائے اور اُٹھ کھڑی ہوئیں۔ زور زور سے ''اڑن چھو لیفٹ رائٹ'' کہتی ہوئی ہجوم میں کھو گئیں۔ دن ہفتہ میں اور ہفتے مہینوں میں بدل گئے مگر چُنّی خالہ پھر کسی کو نظر نہ آئیں۔ وہ کہاں گئیں زندہ ہیں کہ مر گئیں۔ کوئی

نہیں جانتا تھا۔

مانگی لال کی پیشانی پر بل پڑے۔اس کو ہول اٹھنے لگا۔نوکر کو بلایا اور طویلے کے شمالی کونے کا رخ کیا جہاں تخت پر چُنّی خالہ کا تھیلہ رکھا تھا۔مانگی لال پسینہ میں نہا گیا تھا۔خوف سے کانپنے لگا۔دماغ میں کئی وسوسے مکڑی کی طرح پاؤں پھیلانے لگے۔ اسے شک تھا تھیلے میں غیر قانونی اشیاء نہ ہوں۔اس نے لرزتی آواز میں نوکر کو دوڑایا کہ حکیم حمید کو بلالائے تا کہ عزت دار گواہ موجود رہے۔دوتین لوگوں کے نام لیے انہیں بھی فوراً آنے کی اطلاع کردے۔حکیم حمید اور کئی محلّہ والے آگئے۔مانگی لال نے صورتحال سے انہیں آگاہ کیا۔

''چُنّی خالہ کا تھیلہ کھولیں۔کوئی گڑبڑ نہ ہواس میں کیا چیزیں ہیں۔دیکھئے شاید کوئی سراغ مل جائے''

مانگی لال نے نوکر سے تخت پر تھیلے کا سامان انڈیلنے کو کہا۔سب ٹکٹکی باندھے دیکھ رہے تھے اور پھر اُن کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔بچوں کے بہت سے پھٹے پرانے بے جوڑ جوتوں کا ڈھیر چُنّی خالہ کے گمشدہ راز اور وجود کو گہری تاریکی کے غار میں دھکیل گیا۔

ممتا کی انگڑائی

حشمت خاں نے آئینہ کے سامنے اُسی انداز میں مونچھوں پر تاؤ دینے کی کوشش کی جیسے چالیس سال پہلے دفتر جاتے وقت وہ کیا کرتا تھا۔ انگلی اور انگوٹھے سے مروڑ مروڑ کر تیر کی نوک سی نوکیلی بنا کر سینہ پھلا لیا کرتا۔ بھرا ہوا چہرہ، گٹھیلا جسم، سُرخ گال، بادام کی طرح آنکھیں، چوڑی پیشانی اور موٹی موٹی کلائیاں کہ ہر سال گھڑی کی چین بدلوانی پڑتی تھی۔ اڑتالیس انچ کی چھاتی۔ اس کا سر جھک گیا۔ وہ بھول گیا، عمر بڑھتی ہے تو جسم کا کلف بھی نرم پڑ جاتا ہے۔ اسے یاد آیا آئینہ برسوں پرانا ہے۔ لکڑی کا فریم اور اس کی زنگ آلود کیلیں وقت کی رفتار سے کمزور ہو چکی ہیں۔ بالوں پر نظر گئی، چاندی سے تار دکھائی دیئے۔ حشمت خاں کے دل کی دھڑکنیں غوطہ کھانے لگیں۔ اور سارے کس بل ڈھیلے پڑ گئے۔ اس کا دل چاہا مُکّہ مار کے آئینہ چکنا چور کر دے، لیکن ہاتھ اور پنجہ پر اُبھری رگیں دیکھ جھجک گیا۔ دیواروں کا اُکھڑتا پلاسٹر، طاق میں رکھا قرآن شریف، آنگن میں امرود کا پیڑ، ساگون کے پرانے دو پلنگ اور ہاتھ میں پلاسٹک کی باسکٹ تھامے اس کی بیوی حمیدہ بیگم۔۔ سب کچھ روز روز جیسا تھا!

حشمت خاں کا دادا دلاور خاں فیروز خیل شاخ میرازی کا ادنیٰ فرد ضرور تھا مگر بڑا جری، خوددار اور غیور۔ ویسے افغان ادنیٰ ہو کہ اعلیٰ۔ تلوار اور رائفل آخری سانس تک ہاتھوں میں اور نظروں کے سامنے رہتی ہے۔ اس نے سنا تھا کہ امیر حبیب اللہ جب دہلی آیا تھا تو اس نے جامع مسجد میں داخل ہوتے وقت جوتے اتارنے سے انکار کر دیا۔ کئی قبیلوں نے الزام لگایا کہ امیر خفیہ طور پر عیسائی ہو گیا ہے۔ وہ دہلی سے لوٹ کے آیا۔ اور

چار مُلاؤں کو پھانسی پر لٹکا دیا۔ ایک دن ایسا بھی آیا کہ امیر حبیب اللہ کا قتل ہو گیا۔ امان اللہ بادشاہ بن گیا۔ اس کے عہد میں انگریزوں سے تیسری بار لڑائی ہوئی۔ کسی کو ہار کا منہ نہ دیکھنا پڑا۔ ایک دوسرے کے علاقے ہتھیا لیے گئے اور گولیاں چلتی رہیں۔

دلاور خاں نے وہ دن دیکھے تھے۔ چار بیل تھے۔ انگریز کو نشانہ بنانے کا جنون سوار ہوا تو بیل بیچ دیئے اور ایک رائفل معہ دو پیٹی گولیوں سے بھری خرید لیں۔ انگریز حاکم نے اس کے سر پر پانچ سو روپیہ انعام رکھا تھا۔ حشمت کا باپ ذیشان خاں اپنے باپ سے چار قدم آگے تھا۔ صبح سے شام تک پہاڑیوں میں چھپا رہتا۔ اک بار گھات لگا کر گورے فوجی پر جھپٹا اور اس کی رائفل چھین کے فرار ہو گیا۔ مشکل سے تیرہ سال کی عمر تھی۔ مہینہ بھر چٹانوں کے سنگریزے اڑاتے گذار دیئے۔ گولیاں ختم ہوئیں تو چھاتی ٹھونک بابا کے سامنے اونچی آوز میں بولا۔

''بابا اور گولیاں دو۔ ابھی نشانہ ٹھیک نہیں ہوا''!

دلاور خان تخت کے نیچے رکھے ٹین کے صندوق کو باہر کھینچتا اس میں دونوں ہاتھ ڈال کر گولیاں نکالتا اور ذیشان خاں کی جیبوں میں بھر دیتا۔

''لے جالے جا بیٹے۔ سرمہ بنا دے چٹان کا۔''! قبیلہ کے بزرگ بتاتے تھے کہ جب ذیشان خان پیدا ہوا تب دلاور خاں اور قبیلہ کے دوسرے پٹھانوں نے صبح کی اذان ہونے تک ہوا میں گولیاں داغی تھیں۔ دوسرے دن ایک بھی پرندہ ادھر ادھر کے درختوں پر بیٹھنے نہیں آیا۔ خان دادا نے اپنی شادی کے چھ مہینے بعد ایک آدم خور شیر مارا تھا۔ کھال کھینچی، پکوائی اور دادی کی مسہری پر بچھاتے ہوئے کہا تھا۔

''بتول۔ تیری گود میں شیر کا بچہ کھیلے گا''۔ جب وہ لڑائی میں شہید ہوئے اور خون میں لت پت ان کی لاش ڈیرہ پر لائی گئی تو کسی کی آنکھ سے آنسو نہیں ٹپکا۔ فیروز خیل سورماؤں کی آنکھیں اس وقت نم ہوتیں ہیں جب وہ نماز کے بعد اپنے رب سے فتح یابی کے لیے منت سماجت کرتے تھے۔ خان دادا کے جسم پر پندرہ سوراخ تھے۔ سنگدل

انگریزوں کو ڈر تھا کہ زخمی شیران کی تکا بوٹی نہ کر دے۔

''تجھے پندرہ انگریزوں کو ہلاک کرنا ہوگا ذیشان! دادی نے ذیشان بابا کے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے قسم دی تھی۔ ذیشان بابا بھی بڑے جگر والے تھے۔ پہاڑوں کی گود میں گولیوں کی لوری سنے بغیر رات کو نیند نہ آتی تھی انھوں نے دادی کی قسم پوری کر کے دکھائی۔ ہندوستان کی سرحد میں آتے آتے بیس فوجی مار چکے تھے۔

حشمت خاں نے حمیدہ بیگم سے باسکٹ لی اور ہلتا ڈولتا سودا لینے باہر نکل گیا۔ وہ محلّہ سب سے زیادہ گھنی آبادی والا تھا۔ بازار میں ضرورت کی تمام چیزیں آسانی سے ملتی تھیں۔ کرانہ کی چھوٹی بڑی دوکانیں، ریڈی میڈ کپڑے کے شوروم، انگریزی، آیوویدک اور یونانی دوائیں، ڈاکٹروں کے کلینک، دو میٹرنیٹی سنٹر، اسکول کی کتابیں، اسٹیشنری، کرونا اور باٹا کے جوتے، دیسی اور ولائتی شراب یہاں تک کہ کفن دفن اور کریا کرم کا تمام سامان۔ جو چاہو دستیاب ہے۔ راشن کا اناج اور مٹی کے تیل کے لیے لمبی لمبی قطاریں اور پربھاٹا کیز پر بڑا ہجوم رہتا تھا۔ صرف سونا چاندی کے زیور، سرکاری اسپتال، بس اڈہ اور ریلوے اسٹیشن کے لیے دور جانا پڑتا تھا۔ پرائمری اور ہائی اسکول سے آگے پڑھنا ہو تو شہر کے مشرقی کونے میں دو کالج تھے۔ شمشان گھاٹ اور قبرستان بھی وہاں سے پانچ کلومیٹر فاصلہ پر تھا۔

حشمت خاں کو سبزی، حمیدہ بیگم کے لیے کھانسی کا شربت، اور چائے کی پتی لینی تھی۔ سبزی فروش نے آواز لگائی۔

''آؤ چاچا۔ بالکل تازہ سبزی ہے!''

سندھی کرانہ والے نے دانت نکالتے ہوئے کہا۔

''ابا کیا دوں؟''

چیتنا میڈکل اسٹور کے اگروال نے نمسکار کیا۔

''خان بابا۔ کیا طبیعت خراب ہے؟ صبح صبح دوا کی ضرورت پڑ گئی۔ رٹائرمنٹ کے

بعد آئے دن روگ جان سے لگے رہتے ہیں''!

چاچا۔ ابا اور خان بابا کے الفاظ غلیل سے داغی گئی کنکریوں کی طرح حشمت خاں کے کان پھاڑ گئے۔ وہ جھلاتا پیچ و تاب کھاتا خالی باسکٹ لیے گھر لوٹنے کو سڑک پار کرنے میں ادھیڑ عمر کی سردارنی سے ٹکراتے ٹکراتے بچا۔

''اے بڈھے دیکھ کے نہیں چلتا؟'' اس نئے دھماکہ نے حشمت خاں کی چولیں ہلا دیں۔ باسکٹ ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑی۔ ساری پٹھانیت ہوا ہوگئی۔ زور سے زمین پر پاؤں پٹخا۔ جسم کے رگ پٹھے لاٹھی کی چوٹ کھائے سانپ جیسے اینٹھ گئے۔ بچے کھچے دانتوں نے زبان کو چھلنی کر دیا۔ جنم تو اس نے ہندوستان میں لیا تھا لیکن نطفہ اس باپ کا تھا جس کے باپ نے پندرہ گولیاں کھانے کے بعد بھی مسکراتے ہوئے کلمہ پڑھا اور بچوں کے سر پر ہاتھ پھیرنے تک موت کو روکے رکھا تھا۔ تباہ کاری، خوں ریزی اور بربادی کے مہلک ہتھیاروں سے لیس مغربی فوجوں نے ذیشان بابا کے ملک کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ حشمت خاں ٹی وی پر دیکھتا اور ٹھنڈی آہیں بھرتا۔ وہ حمیدہ بیگم سے کہتا کہ ربِ کریم نے وجود میں آتے ہی افغانستان کا مقدر لکھ دیا تھا۔ کوئی کچھ بھی کر لے اسے غلام نہیں بنا سکتا۔ مگر اسے کیا لینا دینا وہ یہاں پیدا ہوا ہے یہیں نال گڑا ہے اور یہاں مذہب کی پابندی پر کوئی روک ٹوک نہیں۔ وہ دانت پیستے ہوئے جھکا اور باسکٹ اٹھا کے ہینڈل مٹھی میں دبوچ لیا۔ اسی طرح جیسے چیتا اپنے جبڑے میں ہرن کی گردن جکڑ لیتا ہے۔ تیوریاں چڑھائے پیشانی کا پسینہ پونچھا اندر آیا اور زور سے باسکٹ دالان کے فرش پر دے ماری۔

حمیدہ بیگم کو ذیشان بابا ناگپور سے بیاہ کر لایا تھا۔ اس کی زبان سے میٹھے سنتروں کا رس ٹپکتا تھا۔ حشمت خاں دفتر سے آتا تو اتنی زور سے دروازہ کی زنجیر بجاتا کہ آس پڑوس کی کھڑکیاں کھل جاتیں۔ حمیدہ بیگم کا بھی معمول تھا کہ پانچ بجے دروازہ کے پاس آ کھڑی ہوتی ادھر حشمت خاں کا ہاتھ زنجیر کو چھوتا ادھر وہ اندر کی کنڈی کھول دیتی۔ سر جھکائے فرش کو تاکتی گلابی ہونٹوں پر مسکراہٹ چھائی رہتی۔ حشمت خاں پلنگ پر بیٹھتا اور وہ بے تابی

سے جھکے جھکے جوتوں کے تسمے کھول دیتی۔ تھوڑی دیر بعد اپنے مور پنکھی ہتھیلیوں سے شوہر کی فولادی پنڈلیوں کو تھپکنے میں مصروف ہو جاتی۔

''آپ باسکٹ خالی ہی لے آئے؟ تھک گئے ہیں۔

ذرا لیٹ جائیں۔ پاؤں دبا دوں!''

''تمھارا سر پھر گیا ہے! حشمت خاں ہتھے سے اکھڑ گیا۔ ''میں تھک گیا'' میں بوڑھا ہو گیا۔ کیا سمجھ رکھا ہے''

غصہ میں جھاگ منہ سے باہر آ گیا۔ حمیدہ بیگم سہم گئی۔ اس عمر کو پہنچنے تک حمیدہ بیگم نے شوہر کے گرجتے کڑکتے مزاج کی طغیانی کو بڑے سکون اور صبر سے روکا تھا۔ ساس نے بیماری کے آخری دنوں میں سمجھا دیا تھا کہ افغانی خون میں اُبال اٹھے تو جان لو جوالا مُکھی پھٹنے کو ہے۔

ذیشان خان اپنے کچھ جانباز قبائلیوں کے ساتھ تین دن اور چار راتوں تک برطانوی پلاٹون کا مقابلہ کرتا رہا۔ اس کے چھ دلیر ساتھی زخموں سے چُور ایک تنگ درّہ کی تاریک غار میں صبح سے تڑپ رہے تھے۔ دشمن کے فوجی پچاس گز دور سامنے کی پہاڑی تک آ پہونچے تھے اور چند ہی گھنٹوں میں ان پر فیصلہ کن حملہ کر سکتے تھے۔ ذیشان خان خالی رائفل چھوڑ کھسکتا ہوا علمدار خاں کے نزدیک آ کر بولا۔

''علمدار بہت ہو گیا۔ یہاں ٹھہرنے کا مطلب ہے خودکشی کرنا۔
کہیں سے کمک آنے کی امید نہیں کارتوس بھی ختم ہو گئے
ہیں''۔

''پھر کیا کریں خان؟ تلوار سونت کر حملہ کر دیں!''

ذیشان خان نے زور دیا کہ علمدار خاں اور دوسرے لڑاکو بچی کھچی گولیاں اسے دیدیں۔ وہ فائر کرتا رہے گا اور باقی اندھیرے میں کیمپ لوٹ جائیں۔ لیکن علمدار خاں بھڑک گیا اور صاف کہدیا کہ میدان چھوڑ کر نہیں جائیں گے۔ مگر ذیشان خاں اپنے فیصلہ

پر اڑ ار ہا۔ علمدار خاں سر جھکائے اپنے ساتھیوں کی طرف آیا جو بائیں طرف کی چٹانوں کے پیچھے رائفلیں تانے انگریزوں کی پہاڑی پر آنکھیں گاڑے ہوئے تھے۔ مغرب میں کوہ ہندوکش کے نیچے بے شمار ندی نالوں میں صدیوں سے پانی بہتا آیا ہے جس کے میٹھے رسیلے تربوز اور خربوزوں کی مہک ہَوا کے دوش پر ان کے نتھنوں میں ابھی بھی گدگدی پیدا کر رہی تھی۔ تاریکی بڑھتی گئی تو دشمن نے فائرنگ بند کر دی۔ ذیشان خان کو یقین تھا کہ سورج نکلتے ہی ان پر ہوائی جہازوں سے آخری حملہ ہوگا اور ان میں سے ایک بھی زندہ نہیں بچے گا۔ علمدار خاں واپس لوٹا اور دوسرے لڑاکوں کی رائے بتائی۔

''دیکھو خان۔ تمھیں چھوڑ ہم سب کنوارے ہیں۔ گھر بار تباہ اور عزیز اقارب شہید ہو گئے۔ آنسو بہانے والا کوئی نہیں ہے''

ذیشان خاں کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد بولا۔

''تو کیا ہم سب لوٹ چلیں؟''

''نہیں۔ ہم نے طے کیا ہے تم اپنی شریک حیات کے ساتھ پہاڑی پہاڑی ہندوستان چلے جاؤ''!

خانم کو ساتھ لئے تنگ درّوں اور وادیوں سے ہوتا ہوا ذیشان خان پیشاور آیا مگر وہاں انگریزوں کی بڑی چھاؤنی تھی۔ ریل اور بس کا سفر طے کرتے ہوئے وہ ریاست ٹونک آ پہنچا۔ وہاں نواب سعادت علی خاں کا راج تھا۔ اسے معلوم ہوا کہ نواب بہادر کی رگوں میں افغانی خون دوڑتا ہے۔ ان کے جد امجد امیر خاں پسر محمد حیات خان ساکن قصبہ سنبھل مراد آباد عالی حوصلہ اور بہادر تھا۔ ہندوستان میں آزادی کی تحریک زوروں پر تھی۔ نواب بہادر انگریزوں کا حمایتی تھا۔ ذیشان خاں کو اپنی قد و قامت اور پختون لب ولہجہ کی وجہ سے ٹونک کی فوج میں ملازمت مل گئی۔

حشمت خاں کو بچپن، لڑکپن اور جوانی کے دن یاد تھے جب ہر زبان پر اس کے فولادی بازوؤں اور نیلگوں آنکھوں کا تذکرہ رہتا تھا۔ دو منزلہ مکانوں کی کھڑکیوں سے

جھانکتی نرگسی آنکھیں، کومل چھاتیوں میں دھڑکتے امنگوں بھرے دل کوئل جیسی کوک کومل کے پنچ رنگی دوپٹہ سے چھان پھینکتے۔ جدھر دیکھو اس کی باتیں اور کنواریوں کی گھاتیں۔ سبزی بیچنے والی کنجڑی ترازو میں رکھے ٹماٹر مٹھی میں اتنی زور سے بھینچ لیتی کہ سارا گودا اس کے گالوں اور چندری پر آچپکتا۔ پلو سے چہرہ صاف کرتے ہوئے وہ بھی چہک اٹھتی۔ بازار میں دوکانوں پر ٹنگی کلاک کی سوئیاں تھرکنا بھول جاتیں۔ ہر دوکاندار میٹھی آواز میں اسے آواز دیتا۔

''آیئے خان بادشاہ!''

حمیدہ بیگم نے غور سے حشمت خاں کی پیشانی کو دیکھا۔ طیش کی سلوٹیں غائب ہوگئیں تھیں۔

''دیکھئے نصیب میرا کھوٹا ہے آپ کو وارث نہ دے سکی۔ اسی بات پر آپ کڑھتے ہیں اور ہروقت غصہ کرتے ہیں''

حشمت خان نے قسم کھا کر یقین دلایا کہ اسے لاولد ہونے کا رتی برابر دکھ نہیں۔ بس کسی بچے کو گود لینے کی حسرت ہے۔

''میں نے کب روکا ہے۔ لے آیئے۔ مجھے بھی تو خوشی ہوگی!''

حشمت خاں نے مسکرا کر اس تتلی کو پکڑنا چاہا جو اڑتی ہوئی آئی اور سامنے کی دیوار پر بیٹھ گئی۔ وہ پلنگ سے اٹھا اور بچوں کی طرح آہستہ آہستہ تتلی کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ تبھی حمیدہ بیگم زور سے ہنس دی۔

''آپ بالکل بچے لگ رہے ہیں''

گھنٹہ بھر پہلے بازار میں سردارنی نے جس حقارت سے ''اے بڈھے۔ دیکھ کے نہیں چلتا'' کہا تھا اس جملہ کا زہر حمیدہ بیگم کے مسکراتے الفاظ نے پل بھر میں چوس لیا۔ حشمت خاں کے مرجھائے گال تمتما اٹھے۔ چہرہ پر نکھار آ گیا۔ تھکی بجھی آنکھوں میں شباب کی لالی چھا گئی، اور ساری افسردگی کافور ہوگئی۔ پچھلے مہینہ جب وہ پہلی پنشن لیکر گھر

آ رہا تھا تب اس کی نگاہیں سامنے چائے کے ہوٹل پر بیٹھے ہنومان اکھاڑے کے مکھیا لال جی پہلوان سے چار ہوگئی تھیں۔ انکل سام جیسی عیاری، نفرت اور دنیا پر راج کرنے کا زہر میں بجھا ہوا ارادہ اپنی لانبی مونچھوں کو بل دیتے ہوئے لال جی اپنے پٹھے سے اونچی آواز میں کہہ رہا تھا۔

''لو دیکھ لو۔ گلاب جامن کا سارا شیرہ سوکھ گیا''

حشمت خاں کے کانوں کی لَویں دہک اٹھیں۔ مٹھیاں خود بخود بھنچ گئیں۔ کلائیوں کی رگیں خون کے تیز بہاؤ سے اُبھر آئیں۔ چہرہ غصہ میں لال بھبھوکا ہوگیا۔ اس نے گردن اٹھا کر لال جی پہلوان کی طرف دیکھا اور چاہا کہ طنزیہ جملہ کا جواب دے کہ تبھی سامنے کچے کوٹھے سے رکمنی بائی نے موٹے ہونٹ کھول دیئے اور مستی سے رنگے مسوڑھے چھوتی آواز نے حشمت خاں کو اپنی طرف متوجہ کرلیا۔

''حشمت لالہ۔ بھگوان سلامت رکھے یہ ڈیل ڈول۔ آج تو ہاتھی کو بھی مات دے رہے ہو''!

حشمت خاں کا کرخت جبڑا اپنی توانائی کے دو بول سنتے ہی موم ہوگیا۔ اس نے لال جی پہلوان کی نشتر زنی کو بھلا دیا۔ جو صرف محلّہ کا ہی نہیں شہر بھر کا جانا پہچانا نام تھا۔ دسہرہ کے جلوس میں لال جی کے ہنومان اکھاڑے کا بڑا دبدبہ رہتا تھا۔ درجنوں شاگرد چمچماتی تلواریں، نیزے اور نوکیلے بلم لئے بازو پھڑ پھڑاتے سینہ تانے نت نئے کرتب دکھاتے اچھل کود کرتے تو کِھلونے کی دوکان میں آراستہ پلاسٹک کی گڑیائیں بھی کانپتی معلوم ہوتیں جیسے زلزلہ کا جھٹکا آگیا ہو۔ پہلوان کی عمر پچاس برس کے قریب ہوگی۔ دوسرے محلوں میں بھی اس کے رعب اور رنگداری کا شہرہ تھا۔ پولس والے پیچھے پیچھے دم ہلاتے اور اس کے مکان کی بیٹھک مںً چھوٹے بڑے نیتا مکھیوں جیسے بھنبھنایا کرتے تھے۔ کسی کی مجال نہ تھی کی پہلوان کے خلاف زبان کھول سکے، گواہی دینے کی بات تو دور تھی۔ اتنے سارے گُرگے اور شہرت کے ہوتے ہوئے بھی لال جی پہلوان کی دھمکیاں رکمنی بائی

کے کوٹھے کے گھنگھروؤں کی جھنکار نہ دبا سکیں۔ ہنومان اکھاڑے والے کافی عرصے سے کوشش کر رہے تھے کہ ہنومان مندر سے دس قدم دور رکمنی بائی کا گھر کسی بھی طرح خالی ہو جائے۔ دو منزلہ چھوٹا سا مکان تھا۔ دو کمرے نیچے اور دو ہی اوپر تھے۔ اس کی نانی بھی یہیں ناچ گانے کا دھندا کرتی تھی۔ پاکستان بننے سے پہلے ممتاز علی رنگریز اس کا مالک تھا۔ وہ سرحد پار گیا تو رکمنی کی نانی نے اونے پونے دام میں اسے خرید لیا تھا اور آج بھی لوگ ممتاز کو گالیاں دیتے ہیں کہ جاتے جاتے شہر کے دل میں کٹار گاڑ گیا۔

حشمت خاں کو مسکراتے دیکھ حمیدہ بیگم کے جان میں جان آئی۔ اس نے باسکٹ اٹھائی اور بولی۔

''اب جایئے بھی سودا لے آیئے! وہ پل بھر کو پلٹی اور دیوار کے سہارے رکھی ہاکی اسٹک اٹھالائی۔

''یہ بھی رکھ لیجئے!

''کیوں؟'' حشمت خاں کے ابرو تن گئے'' کیوں رکھ لوں کیا میں اتنا کمزور ہو گیا کہ لکڑی کا سہارا لوں؟''

حمیدہ بیگم گھبرا گئی۔

''ارے توبہ! میں تو اس لیے دے رہی ہوں محلّہ میں کتنے بہت بڑھ گئے ہیں۔ کل میرا برقعہ نوچے لے رہے تھے''!

حشمت خاں نے باسکٹ تھام لی اور دوسرے ہاتھ میں اسٹک لیے باہر چلا گیا۔ سڑک پر دس قدم بڑھا ہو گا کہ رکمنی بائی کے کوٹھے سے چیخ پکار اور شور غل سنائی دیا۔ بازار میں افراتفری پھیل گئی۔ دوکانیں بند ہونے لگیں۔ سامنے پان کی گمٹھی پر دس بارہ لوگوں کا مجمع تھا۔ حشمت خاں وہاں رُکا اور پوچھ بیٹھا۔

''کیا ہو گیا؟''

''آج معاملہ زیادہ سنگین ہے خان بابا۔''

لال جی پہلوان نے کل مندر میں سوگندھ اٹھائی تھی کہ رام نومی کے دن رکمنی بائی کا کوٹھا خالی کرادے گا۔!

''کیا اس کا راج ہے محلّہ میں؟'' حشمت خاں کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔

لال جی کے آدمیوں نے کافی سامان باہر پھینک دیا تھا۔ رکمنی بائی گلا پھاڑ کے چیخ چیخ کر محلّہ والوں کی خوشامد کر رہی تھی کہ اس ظلم کو روکیں۔ اس کی دس سالہ بیٹی سبک سبک کے رو رہی تھی۔ حشمت خاں نے باسکٹ پان کی دوکان پر رکھ دی اور ہاتھ میں اسٹک لہراتا ہوا رکمنی بائی کے کوٹھے کی طرف بڑھا۔ فیروز خیلی خون کی گردش تیز ہوگئی۔ وہ کڑک کر بولا

''رک جاؤ۔ عورت پر ظلم کرتے شرم نہیں آتی''!

سینکڑوں آنکھوں کی پلکیں جھپکیں۔ بوڑھے اور بچے وہاں سے کھسکنے لگے۔ ہر کوئی خونی تماشہ کے اندیشے سے گھبرا گیا پورے محلّہ میں سنسنی پھیل گئی۔ دومنزلہ مکانوں کی کھڑکیاں کھلنے لگیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ راون کے دس کے دس سر حلق پھاڑے خوفناک قہقہے لگا رہے ہوں۔

رکمنی نے حشمت خاں کو دیکھا۔ اچانک ہنومان اکھاڑے کا نوکیلی دھار والا نیزہ فضا میں بلند ہوتا گیا۔ حشت خاں سمجھ گیا ہندوکش کی پہاڑیاں ریزہ ریزہ ہو رہی ہیں۔ خون میں لت پت رکمنی حشمت خاں سے تھوڑی دور آگری۔

اسی وقت ہزاروں لوگ کیا خود حشمت خاں حیرت میں ڈوب گیا جب ایک برقعہ پوش عورت نے رکمنی کی بیٹی کا ہاتھ پکڑا اور واپس اس گلی میں گھسیٹتی چلی گئی جہاں سے کچھ دیر پہلے حشمت خاں باسکٹ اور ہاکی اسٹک لے کر آیا تھا۔

☆☆☆

خدائی خدمتگار

جب حضرت آدم جنت سے نکالے گئے اور زمین پر آئے تو انہوں نے دریا میں مچھلی اور خشکی پر گِدھ کو دیکھا۔ دریا کنارے سوکھے پیڑ پر رات کو بسیرا کرتے وقت گِدھ نے مچھلی کو پکارا اور فکرمند ہو کر بتایا کہ آج دھرتی پر آسمان سے ایسی بلا اُتری ہے جو اپنے بڑے بڑے پیروں پر چلتی ہے اور کسی بھی چیز کو ہاتھوں سے پکڑ لیتی ہے۔ مچھلی خوف سے کانپ اُٹھی اور بولی ''اگر تُو سچا ہے تو اب دریا میں مجھے اِس بلا سے نجات ملنے والی نہیں اور خشکی پر تجھے موت سے خلاصی ممکن نہیں''۔ رامائن کے جٹایو گِدھ راج کو سارا جگت جانتا ہے۔ راون جب اپنی کارستانی سے سیتا میّا کو اغوا کر کے لے اُڑا تب جٹایو نے آکاش میں اُس سے سنگھرش کیا اور اپنے دونوں بازو کھو بیٹھا۔ وہ بڑا بھاگیہ شالی تھا کہ بھگوان رام کی گود میں سیتا ہَرن کی خبر سنا کر دَم توڑ دیا۔

دریاپور کی آبادی دس ہزار ہوگی۔ اُس میں قریب قریب بسے ہوئے کئی گاؤں شامل تھے اور آج رات پنچایت بھون میں گرام پنچایت کی بیٹھک تھی۔ حافظ شکور نے پنچایت میں چندن موچی کے خلاف تحریری شکایت دی تھی۔ چندن گاؤں گاؤں بیل گاڑی میں گھوم کر مردہ جانور لاتا ہے۔ کھال اتارنے کے بعد لاشیں قریب کے جنگل میں پھینک دیتا ہے۔ ہَوا کے جھونکے جانوروں کی بدبو، دریاپور کے گھروں میں پھیلاتے ہیں۔ کھانا پینا کیا سانس لینا بھی دُوبھر ہوگیا ہے۔ نت نئی بیماریاں پاؤں پھیلا رہی ہیں۔ اس لئے پنچایت چندن کو پابند کرے کہ وہ لاشیں گہرے گڑھے کھود کر دفن کیا کرے۔ حافظ شکور گاؤں میں سب سے زیادہ پڑھے لکھے اور عزّت دار آدمی تھے۔ کچی

مسجد میں بچّوں کو قرآن شریف کا درس اور پانچ وقت کی نماز پڑھاتے تھے۔ بیتے دور میں دریاپور راجہ محمود آباد کی حکومت کا چھوٹا سا گاؤں تھا۔ آزادی کے خوں ریز دنوں میں بھی وہاں بھائی چارے کا ماحول رہا اور آج بھی جو ہیں خوش و خرم ہیں۔

سرپنچ مادھولال بیٹھک سے آدھے گھنٹے قبل گھر سے نکل پڑا۔ کھدّر کی سفید ٹوپی، اُسی کپڑے کا کُرتا اور پائجامہ پہنے وہ زور زور سے ہارن بجا رہا تھا۔ اسکے گھر سے پنچایت بھون کا فاصلہ مشکل سے سو گز ہوگا۔ مگر ہفتہ بھر پہلے خریدی گئی موٹر سائیکل کی کان پھاڑ دینے والی پھٹ پھٹ دریاپور کی کچّی سڑکوں اور بھولے بھالے لوگوں کے لیے عجوبے سے کم نہ تھی۔ مادھولال یوں اپنا دبدبہ اور برتری جتا کے اندھوں میں کانا راجہ بننے میں فخر محسوس کرتا تھا۔ یہ ضرور تھا کہ اُس کے سرپنچ ہونے کے ایک سال کے اندر گاؤں میں چار ٹیوب ویل پانی اُگلنے لگے اور بجلی سے ہر گھر روشن ہوگیا۔ ویسے بھی امبیڈکر ایکتا منچ کا پردھان ہونے کے ناطے کلکٹر، تحصیلدار اور پولس والے اس کی باتوں پر کان دھرتے تھے۔

حافظ شکور کی عرضی میں اُٹھائی گئی بات پنچوں کے دماغ میں گھر کر گئی۔ وہ تحصیل اور شہر جاتے تو خبریں سننے کو ملتیں۔ مویشیوں میں طرح طرح کے روگ پھیل رہے ہیں ۔ جہاں دیکھو ایک دو بھینسوں کی لاشیں پڑی مل جاتی ہیں۔ مالک جیسے تیسے اُٹھوا کے آبادی کے باہر پھنکوا دیتا ہے۔ جہاں وہ سڑتی رہتی ہیں اور ان میں کیڑے پڑ جاتے ہیں۔ سرپنچ مادھولال بھاری آواز میں بولا۔

''حافظ جی نے سچ کہا ہے یہ گمبھیر معاملہ ہے۔ دیش
میں گِدھوں کا اکال ہے۔ پنچ دھیان دیں اور فیصلہ کریں''

سب نے ایک آواز میں فیصلہ سنا دیا۔

''چندن کل سے جانور زمین کے بھیتر گاڑے گا''

چندن ہاتھ جوڑے کھڑا تھا۔ انگارے جیسی دہکتی آنکھوں سے اُس نے حافظ

شکور کو کھا جانے والے انداز سے گھورا۔ کدال پھاؤڑا خریدنے کا خرچ اور گڑھا کھودنے کی کڑی محنت کے خوف سے اُس کا دماغ تپ گیا۔ پل بھر کو حافظ شکور اسے راون دکھائی پڑے۔ اور اس کا جی چاہا کہ گِدھ راج کی طرح جھپٹ کے ان کی نورانی آنکھیں نوچ لے۔ کھال کھینچ کر لاش چیل کوؤں کے آگے پھینک دے۔ چندن سر کچلے سانپ سا بل کھاتا غصّے میں بھرا ہوا وہاں سے لوٹ آیا۔ پنچ بیٹھے رہے۔ سرپنچ نے پنچوں کے ساتھ حافظ شکور کو بھی روک لیا۔

''پنچو'' مادھو لال نے پان کی پیک تھوکتے ہوئے کہا۔

''کل کلکٹر صاحب کے دفتر میں میٹنگ ہوئی تھی۔'' اُس نے تفصیل سے بتایا۔ ضلع بھر کے سرپنچ اور دفتروں کے چھوٹے بڑے افسر موجود تھے۔ دلی سرکار نے مکھیہ منتری کو چٹھی بھیجی ہے۔ دیش سے گِدھوں کی نوّے فیصدی آبادی ختم ہوگئی ہے۔ اس کارن مانس جیون اور واتاورن کو سنگین خطرہ درپیش ہے۔ کلکٹر صاحب نے ادھیکاریوں کو فوری کارروائی کے لیے ڈھیر سارے سُجھاؤ دیے۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ سمراٹ اشوک کا ہردے پریورتن بھی جٹایو گِدھوں نے کیا تھا۔ کالنگا کی لڑائی میں سمراٹ نے لاکھوں آدمی ہلاک کر دیئے تھے۔ دوسری صبح میدانِ جنگ میں ایک بھی لاش نظر نہ آئی۔ صرف ہڈّیاں بچی تھیں۔ اشوک کا دل انسانی زندگی کی بربادی اور ناقدری پر دہل اُٹھا اس نے ہمیشہ کے لیے جنگ سے منہ موڑ لیا۔

''اس لیے آپ ہر گاؤں باسی کو سوچنا دے دیں۔ دریا پور
اور آس پڑوس میں کسی کو گِدھ دکھائے پڑے تو وہ ترنت
پنچایت کو سوچنا دے اور پچاس روپیہ انعام لے جائے''

پنچوں نے یقین دلایا کہ دریا پور کا بچّہ بچّہ اس کام میں جُٹ جائے گا۔ مادھو لال نے پھر کہا۔

''ہاں۔ ایک بات اور کلکٹر صاحب نے بتائی تھی کہ بالی کے

قتل کے بعد سمپاتی نام کے گِدھ نے بھگوان رام سے کہا تھا

کہ سیتا میا لنکا میں قید ہیں''

ایسے دلکش مذہبی حوالے سننے کے بعد دریاپور کے پنچوں نے پہلی بار اس سچائی کی طرف دھیان لگایا کہ واقعی گِدھ یم کے دُوت ہیں جو موت سے ہار گئے۔ کئی برسوں سے خود انہوں نے گِدھ کے درشن نہیں کیے تھے۔ پنچایت بھون میں دیر رات تک اس بدصورت پرندے کا تذکرہ ہوتا رہا۔ حافظ شکور نے اپنی قابلیت کے جوہر دکھائے کہ گِدھ چونچ سے شکار کرتا ہے پنجوں سے نہیں۔ اُس کی نظر بہت تیز ہوتی ہے۔ ہَوائی جہاز کی اونچی اُڑان سے بھی زیادہ بلندی سے مردار جانور کو تاڑ لیتا ہے۔ اتنی ہی تیز اس کی سونگھنے کی طاقت بتائی گئی ہے۔

''مگر سرپنچ جی گِدھ اگر خوشبو سونگھ لے تو فوراً مر جاتا ہے۔''

پنچایت گھر میں بیٹھے لوگوں کو وہ دن بھی یاد آئے۔ ٹی وی پر رامائن شروع ہوتی تو دور دراز کی بستیوں سے بوڑھے، جوان، بچّے اور عورتیں منہ اندھیرے بیل گاڑیوں میں دریاپور کے لیے نکل پڑتے۔ آٹھ بجے نائب تحصیلدار کے دفتر میں تِل رکھنے کی جگہ نہ رہتی۔ ایک بڑی ٹیبل پر دوسری ٹیبل رکھی جاتی اور اس کے اوپر ٹی وی سجایا جاتا۔ میز پر گیندے کے تازہ پھول بکھرے ہوتے جیسے ٹی وی نہیں کسی دیوتا کی پوِتر مورتی ہو۔ وہاں جتنے سرکاری کرمچاری تھے اپنے بیوی بچّوں کے ساتھ اگلی صف میں کرسیوں پر آ بیٹھتے۔ سڑک پر بھی لوگ ٹی وی کھُلنے کا بے چینی سے انتظار کرتے۔ اُس علاقے سے گذرنے والی مسافر بسیں بھی رُک جاتیں اور اچھا خاصہ میلہ لگ جاتا۔ چائے پان، سموسے کچوری اور گرم پکوڑوں کے ٹھیلے والے بھی خوب کمائی کرتے۔

جیسے ہی بھگوان رام اور سیتا لکشمن اِسکرین پر آتے پورا قصبہ ''جے سیا رام'' کے نعروں سے گونج اُٹھتا۔ مجمع میں دریاپور کے ہر طبقے کی نمائندگی تھی۔ راون آکاش میں سیتا میا کو لے کر اُڑا تو بہت سوں کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ عورتوں کی دبی دبی چیخیں بھی

سنائی دیں۔کوئی اونچی آواز میں بول اُٹھتا۔

''ہے رام۔اب کیا ہوگا؟'' سین آگے بڑھا اور سب ہی خوشی سے جھوم اٹھے۔جٹایو گِدھ راج نے راون کو للکارا اور جان کی پرواہ کیے بغیر اُس پر حملہ کر دیا۔راون نے اپنی تلوار سے جیسے ہی جٹایو کے بازو کاٹے تو دیکھنے والے غم میں ڈوب گئے اور آنسو پونچھنے لگے۔دو سال تک عقیدت کی گنگا بڑی روانی سے یوں ہی بہتی رہی۔

پنچایت بھون سے سب اُٹھے تو بنواری اُچک کر مادھو لال کی موٹر سائیکل کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔

''چلو۔میرے گھر چائے کا ایک ایک کپ پی لیں''

بنواری پہلی بار پنچ بنا تھا۔تعلیم کے نام پر جہاں تہاں ضرورت پڑتی بڑی مشکل سے آڑی ترچھی ہندی میں دستخط کر دیتا تھا۔ویسے بھی جمہوریت میں باگ ڈور کا حصہ دار بننے کے لیے چار اکھشر لازمی نہیں ہوتے۔

''سرپنچ جی۔یہ بتاؤ کل یگ میں رام بھگت کیوں ختم ہو رہے ہیں''

مادھو لال نے کلکٹر آفس میں سنی سنائی باتیں بتا دیں۔دھن دولت والوں کی ہر آتی جاتی سانس روپیہ چاہتی ہے۔اس لیے کمانے کے چسکے میں وہ ساہوکاری ڈھنگ اپناتے ہیں۔بھینس دودھ روک لے تو بس انجکشن ٹھونک دیا۔اُن کی دیکھا دیکھی گاؤں والے بھی لالچ میں آ گئے۔ایک روپیہ کا انجکشن دو کلو دودھ نکال دیتا ہے۔

''رام قسم بنواری ایسا زموہی انجکشن ہووے ہے کہ بھینس تڑپ کے پیشاب کر دیتی ہے''

وہ چائے کی چسکیاں لیتا رہا اور بنواری کو نئی نئی باتیں جو خود اُس نے سنی تھیں بتاتا رہا۔زیادہ دودھ نکالنے کے لیے اور معمولی بخار تک میں طرح طرح کی دوائیں

اور انجکشن دیتے ہیں۔ اور جب بھینس کسی بیماری سے دم توڑ دیتی ہے تو جنگل میں پھنکوا دیتے ہیں۔ گِدھ اِن مردہ بھینسوں کو کھاتے ہیں تو وہ بھی مر جاتے ہیں۔ دھنی سر اٹھا کے کہتا ہے۔

''چلو بھینس کی پوری قیمت وصول ہوگئی اور دو پارٹی مفت میں مِل گئیں۔''

چندن موچی اُس رات بیوی رُکما کے مائیکہ چلے جانے سے ویسے بھی اُداس اور اُکھڑا ہوا تھا۔ حالانکہ معاملہ زچگی کا تھا۔ لیکن حافظ شکور کی شکایت نے اُس کے مزاج کو تلملا کے رکھ دیا۔ اس نے پانچ سال اپنے باپ کے ساتھ جنگل میں جانوروں کی کھال ادھیڑنے کا ہنر سیکھا تھا اور جوتے گانٹھنے میں مہارت حاصل کی تھی۔ اُھر گِدھوں کی تلاش میں گاؤں والوں کی بھاگ دوڑ اور لگن دیکھ اسے باپ کی یاد آئی۔ جو بھینس کی لاش سے دُور بیٹھے گِدھوں کے جھنڈ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے چندن کو سمجھاتا۔

''وہ لال مُکٹ اور کالے رنگ والا راج گِدھ ہے''

''چندن۔ سفید پیٹھ کا نظر آتا ہے تجھے۔ یہ چمر گِدھ ہے''

''اور یہ چھوٹا سفید گِدھ جس کی گردن کے بال کھڑے ہیں، چونچ، منہ اور پنجے پیلے ہیں اسے گوبر گِدھ کہتے ہیں۔ اچھی طرح دیکھ لے۔ یہ چیل سے مِلتا جُلتا ہے''۔

''بابا اِس کا نام گوبر گِدھ کیوں ہے؟''

''چندن بیٹے۔ گوبر گِدھ مانس بھی کھاتا ہے اور جانوروں کا گوبر بھی چٹ کر جاتا ہے۔''

اب سوال گِدھ کی نسل کو پہچاننے کا نہیں اسے کھوجنے اور ٹھکانے سے بسانے اور بڑھانے کا تھا۔ مادھو لال کو چندن پر بڑا بھروسہ تھا۔ اُس کا کئی دیہاتوں میں آنا جانا رہتا تھا۔ برسوں اُس نے گِدھوں کی موجودگی میں مُردہ جانوروں کی چیر پھاڑ کی

تھی۔ ہر چند کہ دریاپور کے باسیوں نے دیمک کے دانت، سانپ کے پاؤں اور چیونٹی کی ناک نہ دیکھی ہو لیکن مادھو لال کو گاؤں سے تھوڑی دور جھونپڑی میں لاشوں سے نکالی چربی اور اسے پگھلا کے ٹین کے کنستروں میں حفاظت سے رکھنے والے چندن کی ایسی بہت سی خوبیاں دیکھ چکا تھا۔ جن پر کسی کی نگاہ نہ پڑی تھی۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ چندن چربی کا کیا استعمال کرتا تھا۔ مٹی کے دو دیپک ضرور شام سے جھونپڑی کے باہر جلا دیتا تھا جو سویرے تک روشن رہتے۔ ایک وقت تھا جب چندن کی جھونپڑی کے ارد گرد اوپر آسمان میں سینکڑوں گِدھ گردش کرتے تھے۔

''تم ناراض نہ ہونا چندن'' مادھو لال نے دوسرے دن اسے خوب سمجھایا کہ حافظ شکور نے گاؤں کی بھلائی کے لیے لاشیں گاڑنے کی بات پنچایت میں اٹھائی تھی۔

''ایک مزدور رکھ لے گڑھا کھودنے کو۔ پنچایت فنڈ سے میں
مزدوری بھگتان کر دونگا۔''

چندن تو بھاڑ کے چنے کی طرح اُچھل رہا تھا۔ اسے نہ جٹایو اور نہ ہی سمپاتی گِدھ کی پاکیزگی اور تیاگ سے دلچسپی تھی۔ اُس کی آنکھوں میں حافظ شکور ایک فربہ مینڈھے کی طرح مچل رہا تھا۔ جس کی چربی سے اپنے جسم کی مالش کر کے وہ امر بن جانے کا ارادہ کر چکا تھا۔ اُس نے نفرت بھرے لہجے میں حافظ شکور کو گالیاں دیں۔ یہ بھی کہا اگر اس کو موقع مل جائے تو حافظ جی کو بھینس کی کھال میں سی کر ندی میں پھینک دے کہ مگرمچھ پیٹ بھریں اور ڈکار بھی نہ لیں۔

''سرپنچ جی میں تمھارا اسمان کروں ہوں۔ مگر وہ مُلاّ مُٹھی بھر بھِک منگوں کے بل بوتے گاؤں کا مُکھیا بننا چاہتا ہے''

مادھو لال نے جی توڑ کوشش کی۔ بیڑی کا پورا بنڈل پھونک ڈالا مگر پتھر میں جونک نہ لگا سکا۔ چندن جوالا مکھی کے لاوے جیسا اُبال پر تھا۔

''تُو چنتا نہ کر۔ بس گِدھ راج ڈھونڈتا رہ۔ کلکٹر صاحب

میری چھاتی پر سونے کا تمغہ لگا دیں تب تیرے لابھ کی بھی
سوچوں گا''

دریا پور کے پنچایت بھون سے بات چلی اور پھر پگڈنڈیوں، گھنے جنگلوں سے گذرتی ندی نالے پار کرتی ہوئی گھاس پھوس، کچے مکانوں، مویشی کے باڑوں اور کھیت کھلیانوں میں جٹایو کی کہانی امر ہوگئی۔ سورج کی پہلی کرن کے ساتھ آنکھیں آسمان کی طرف اُٹھ جاتیں اور تھک ہار کر شام ہوتے ہی جھک جاتیں۔ پچاس روپیہ کا انعام پانے کی لالچ نہ جانے کتنی انگلیوں کو درانتی کی دھار پر زخمی کر چکی تھی۔ گاؤں گاؤں چھوٹے بڑے لڑکے مویشی کو چَرانے میں کم دلچسپی رکھتے اور گِدھ کی تلاش میں کھانا پانی بھی بھول گئے۔ دو چار دن آنکھ اور آکاش کے رشتے نے سب کو دیوانہ بنا دیا۔ بدنما پرندے سے صدیوں پرانی عقیدت کو پچاس روپیہ کا انعام زیادہ مدّت تک باندھے نہ رکھ سکا۔ ہاتھ میں کمنڈل، ماتھے پر سفید تلک اور کاندھے پر بھگوا چادر ڈالے بکھری داڑھی والا کوئی سادھو سنیاسی، لاٹھی ٹیکتا دریا پور کی کسی سڑک پر نظر آجاتا تو بچّے اسے گھیر لیتے۔

''بابا جٹایو گِدھ کا پتہ بتا دو۔''

''مورکھو۔'' لاٹھی زور سے بج اُٹھتی

''وہ بھگوان رام کی گود میں سدا کے لیے مرتیو پا گیا بس رام رام کرو۔ اسے کھوجنا سے اور دھن کو برباد کرنا ہے۔'' پھر آہستہ آہستہ یہ نشہ اُتر گیا۔

ہفتہ بھر گذرا ہوگا کہ حافظ شکور کے محلے سے دو چار لوگ مادھو لال کے پاس آئے۔ اُن کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ بڑی مشکل سے بس یہی بتایا حافظ جی جمعہ کی نماز پڑھنے سائیکل سے تحصیل شہر گئے تھے۔ دو دن ہوگئے لوٹ کر نہیں آئے۔ بیوی بچّے رو رو کے ہلکان ہیں۔ تحصیل میں حالات اچھے نہیں ہے۔ بری بری خبریں سننے میں آرہی ہیں۔ محلے میں سب ڈرے اور سہمے ہوئے ہیں۔

''آپ فکر نہ کرو۔ میں پتہ لگواتا ہوں'' مادھولال اتنا کہتے ہوئے اُٹھا ہی تھا کہ بنواری پنچ اور دوسرے لوگ سرپٹ بھاگتے وہاں پہنچے۔ سانس پر قابو پاتے ہوئے بنواری بولا۔

''جلدی چلو سرپنچ جی۔ ندی کی طرف''

''بات کیا ہے؟۔ بتاؤ تو۔ کیا باڑھ آگئی؟

''ندی کے اوپر دو گِدھ اُڑ رہے ہیں'' بنواری نے اتنا ہی کہا تھا کہ مادھولال چپل چھوڑ ننگے پاؤں ان کے ساتھ ہولیا۔ اُس کی آنکھیں خوشی سے چمک گئیں۔ وہ سب چلے تو پیچھے بھیڑ بڑھتی گئی۔ ندی سے دس بیس گز دور مادھولال نے سب کو روک دیا۔ ہر ایک آنکھ آسمان کی طرف اٹھی۔ دو گدھوں کو چکّر لگاتے دیکھا تو پنچوں کی باچھیں کھِل گئیں۔ مانو جیسے بھگوان نے لعل وجواہر بکھیر دیے ہوں۔

''چندن کو جلدی سے بلوا بھیجو۔ کسی کو دوڑاؤ''

''اس کی کیا ضرورت آن پڑی سرپنچ جی؟''

''ارے بھئی کسی جانور کی لاش منگوانی ہوگی گدھوں کو اُتارنا پڑیگا۔ دریاپور میں ان کا بسیرا ضروری ہے''

یکا یک انہوں نے تحصیل سے آنے والی سڑک پر چندن کو بیل گاڑی بھگائے آتے دیکھا۔ وہ بیدردی سے بیلوں پر چابک برسا رہا تھا۔ رفتار اتنا تیز تھی کہ پیچھے دھول کے بگولے اُڑ رہے تھے۔ مادھولال جھٹ پٹ سڑک کے کنارے آ کھڑا ہوا۔ دونوں ہاتھ بلند کیے اور چندن کو گاڑی روکنے کا اشارہ کیا۔ مگر چندن نے اُدھر کو دیکھا تک نہیں اور نہ ہی رفتار کم کی۔ مادھولال کی نظریں گاڑی میں بڑی سفید چادر سے ڈھکی لاش پر پڑیں تو وہ گھبرا کر بنواری سے بولا۔

''ہائے رام۔ گؤ ماتا کی لاش معلوم ہوتی ہے''۔ وہ حلق پھاڑ کے چلاّیا۔

''چندن رُک جاؤ۔ جانور یہیں اُتار دو۔'' چندن کے رویہ سے مادھولال

غصے میں آگ بگولہ ہو گیا۔ باقی پنچ بھی حیران تھے کہ آخر چندن پر ایسا پاگل پن کیوں سوار ہے۔ کیا پوری بوتل چڑھا لی۔ پنچوں کا ایمان برداشت سے باہر ہو رہا تھا۔ چندن نے کسی کی پرواہ نہیں کی اور وہ گاڑی بھگا تا رہا۔ وہ سب غصے میں چندن کی بیل گاڑی کے پیچھے دوڑے۔ پانچ منٹ کے تعاقب اور پسینے میں شرابور ہونے پر ان کے پاؤں ایک دم تھم گئے۔ چندن نے کچی مسجد کی بغل میں گاڑی روک دی۔ محلے کے لوگ وہاں اکٹھے ہو گئے تھے۔ پنچوں کو بھاگتے اور چندن کے خلاف گالیاں بکتے دیکھ مجمع بڑھتا گیا۔ بنواری کے ہاتھ سے لٹھ چھین کر مادھو لال غصے میں چندن پر وار کرنے کے لئے آگے بڑھا۔ تبھی چندن نے زور سے آواز لگائی۔

''ارے گھر میں کوئی ہے۔ باہر آؤ اور ہمری گاڑی سے ہاجی جی کو اُتار لو۔ ورنہ لاش سڑ جائے گی۔''

☆☆☆

اُٹھو مومنو!

''اٹھو مومنوں۔ سحری کا وقت ہو گیا!''

ٹھاکر مہندر پرتاپ سنگھ کے پرانے محل کی شکستہ دیواریں چھیدتی اور برفیلی رات کی دھند کو دھکیلتی صدا نے نذیرن کے کانوں میں رس گھول دیا۔ جھٹ لحاف سے منہ نکالا۔ انگلیوں سے آنکھیں صاف کیں اور بغل میں لیٹے کرم خان کو جھنجھوڑا جو کمر کے بل الٹے ہوئے کچھوے کی طرح پڑا تھا۔ بیتی دوپہر سے کھانسی اور بخار نے اسے ادھ مرا کر دیا تھا۔

''اب اُٹھ بیٹھو۔ اِستری کا وقت ہو گیا!''

فقیر کی دور جاتی آواز نذیرن کے بیٹھ جانے اور پلنگ کی چولیں ہلنے سے کرم خاں نے ہڑبڑا کے سر سے لحاف سرکایا۔

''کرم جلی۔ فقیر روزہ داروں کو آواز دے رہا ہے۔ مجھے کیوں جگا دیا!

اسے گھنٹہ بھر نیند آئی ہوگی۔ دو بجے تک کھانسی اور چھینکوں نے پسلیوں کا کچومر نکال دیا۔ آنکھوں سے پرنالا بہتا رہا۔ نتھنوں سے کبھی پتلا اور کبھی گاڑھا اتنا مواد نکلا کہ گز بھر کے گچھے کو زچہ کے بستر کی چادر بنا دیا۔ نذیرن نے چار بار ملٹھی اُبال کے پلائی مگر رتی بھر فائدہ نہ ہوا۔ بڑی مشکل سے اجوائن چباتے چباتے اس کی آنکھیں بند ہو گئی تھیں۔

پچاس سال پہلے جب وہ بنارس آیا تو جوان تھا اور نذیرن امرود جیسی گدرائی اور بھڑکیلی تھی۔ مندروں کے شہر میں سال بھر تا قوس کی ترنگیں بکھری رہتی تھیں لیکن سال

کے ایک مہینہ سحری کی مستانی اور دلکش صدائیں گنگا کی لہروں میں ستارے ٹانک دیا کرتی تھیں۔ ٹھاکر مہندر پرتاپ سنگھ کی چتا جلے سال بھر ہوا ہوگا کہ بڑے کنور رام پال سنگھ اپنے دوست لالہ کرم چند کی بیٹی کے بیاہ میں بھدوئی آئے۔ پتنی اور دونوں بیٹے ساتھ تھے۔ کرم خاں کا باپ تحصیل بھدوئی کا پرانا دھوبی تھا۔ لالہ جی نے سو سے اوپر براتیوں اور خود اپنے مہمانوں کے لئے اگروال دھرم شالہ میں شایان شان انتظام کیا۔ کپڑے لتے عام طور سے سب ساتھ لاتے ہیں لیکن استری کے لئے دس دھوبی پابند کئے گئے۔ کرم خان جوان، خوبرو اور گھٹیلے بدن میں سب کو بھا گیا۔ خود اس کی ایک مہینہ پہلے شادی ہوئی تھی۔ آنکھوں میں لذتوں کا خمار اور ہاتھوں میں بجلی سے بھری تھی۔ قیمتی کپڑوں پر ایسی ہنرمندی سے استری کرتا کہ صبح پہن لو اور شام تک ایک بھی سلوٹ ابھرنے کا نام نہ لے۔ رام پال سنگھ اور ان کے دونوں بیٹوں کا کرم خاں نے دل جیت لیا۔ محل میں پانچ سو گز احاطے میں دو کمرے تعمیر کرنے، تین سو روپیہ ماہانہ، اور سال بھر کے لئے ایک مانی گیہوں کی رضامندی ہوگئی۔ کرم خاں اور نذیرن بنارس آئے تو بھدوئی جانے کا کبھی نام نہ لیا۔

کرم خاں کو بنارس کی سردیوں کا خوب تجربہ تھا کہ جنوری کا نزلہ زکام حلق میں پھنسا مچھلی کا کانٹا ہوتا ہے۔ نذیرن نے بے وقت جگا دیا۔ اسے لگا جیسے پیتل کی گرم استری کمر پر پھیر دی۔ محلّہ کے ہزاروں مکانوں میں مشکل سے بیس گھر تھے جہاں رمضان دبے پاؤں آتا اور سحری ایمان کی زنجیر ہلانے کی ناکام کوشش کرتی آگے بڑھ جاتی۔ نذیرن کو معلوم تھا کہ بیتے پچاس سال میں رمضان کے آخری جمعہ کے دن کرم خاں نے لے دے کے دس بیس روزے رکھنے کی ہمت جٹائی ہوگی۔

''کیا آج جمعہ ہے؟ اس نے ناگوار لہجہ میں پوچھا اور ترچھی نظروں سے دیکھا کہ نذیرن استری میں کوئلہ پر مٹی کے تیل کے چھینٹے چھڑک دیا سلائی جلا چکی تھی۔

''ابھی سے جمعہ کہاں! ٹھاکر صاحب کا سوٹ اور قمیض پریس کرنی ہے''!

گتّے کے ٹکڑے سے دو چار بار ہوا کی اور کوئلے دہک اٹھے۔ کرم خاں نے لحاف اوپر کو کھینچ لیا کہ چنگاریوں سے دور ہو جائے۔ چھینکیں کم ہو گئی تھیں مگر کھانسی جان لینے پر اتاروتھی۔ جیسے تیسے بستر چھوڑا اور حلق سے بتاشے جیسے بلغم کا ٹکڑا راکھ کے ڈھیر پر اگلتا ہوا دروازہ کی نالی پر پیشاب کرنے بیٹھ گیا۔

''ارے ارے کیا کرتے ہو۔ باہر جاؤ'' نذیرن تلملا کر چیخی۔

''کھانسی بخار میں کیسے جاؤں۔ لقوہ مار جائے گا''!

نذیرن ایلمونیم کے پیالہ میں گرم گرم چائے لائی۔ ایک ہاتھ سے کرم خان کو سہارا دیکے نالی سے اٹھایا۔ چھینک اور کھانسی نے ازار بند کو غبارے کا دھاگہ بنا دیا کہ بار بار ہاتھ سے چھوٹ جاتا۔ چائے کا پیالہ پلنگ پر رکھ کے نذیرن نے ازار بند باندھ دیا۔ پرانی صدری میں روئی کی گٹھلیاں بن گئی تھیں۔ مفلر کہنے کو اونی مگر پرانی خس کی ٹٹی کی طرح چھید ہی چھید کہ سفید بال جہاں تہاں جھانکتے رہتے۔ کرم خاں کانپتا کھانستا پلنگ پر بیٹھا اور دو چار گھونٹ میں چائے پی لی۔

'صبح ڈاکٹر کو دکھا آؤ۔ چلو پریس گرم ہو گئی'' نذیرن نے محل کی وفاداری کا واسطہ دیکر حوصلہ بڑھایا۔ کرم خاں کا ہاتھ پکڑے بڑی ٹیبل تک لے آئی۔ بڑے ٹھاکر اوران کے مہمان کو کسی منتری جی سے ڈاک بنگلہ ملنے جانا تھا۔ کل شام دو اونی سوٹ اور قمیض محل سے بھجوائی گئی تھیں اور صبح سات بجے واپس پہنچانے کا حکم تھا۔ نذیرن نے جیسا سنا تھا ویسا ہی بتایا کہ مہمان کھرب پتی ہے۔ پورے پردیش میں زمینیں خریدتا ہے اور بنگلے بنا کے بیچ دیتا ہے۔ کئی منتری اپنا کالا دھن اس ہی کے دھندے میں لگاتے ہیں۔ سفید چمچماتی کار میں آیا ہے۔ بنسی لال نے بتایا تھا کہ پندرہ لاکھ روپے کی کار ہے۔ گرمی میں انجن سے ٹھنڈی ہوا آتی ہے۔ باہر لو چلتی ہو مگر مجال کہ اندر کسی کے چہرے پر پسینہ کی بوند بھی ابھر جائے۔ کرم خاں کھانسی پر لعنت بھیجتا خاموشی سے نذیرن کی باتیں سنتا رہا۔ ٹیبل پر پتلون تہیں کھول کر پھیلایا۔ سفید ململ کے کپڑے سے ڈھانپا

اور پانی کے چھینٹے دیکر استری پھیرنا شروع کی۔ ٹھاکر صاحب نے نہ جانے کتنے سال بعد سوٹ نکالا تھا۔ فنائل کی گولیوں کی خوشبو سے کرم خاں کی ناک میں مرچیں سی لگنی لگیں۔ اس نے گُچھے کو اس طرح منہ سے باندھ لیا کہ بس سانس آئے جائے باقی سب کچھ اندر ہی رہے۔ چھ کپڑوں کو سنوارنا دلہن کے حسن کو چار چاند لگانے سے کم دشوار کام نہ تھا۔

''میں نے منع کیا تھا'' وہ گھٹی گھٹی آواز میں بولا ''رحمت کی شادی شہر کے دھوبی گھرانے میں مت کرو۔ مگر تو نے اور تیری ماں نے ایک نہ سنی!''

نذیرن کے چہرے پر پل بھر کو شادابی سی آئی اور پھر اداسی چھا گئی۔ بہو بیٹے کی یاد آئی اور جھرّیوں نے ہلکورے سے لیے۔ رحمت نے اسی محل میں آنکھیں کھولیں۔ پلا بڑھا۔ پھر کوئی اولاد نہ ہوئی۔ بڑے ارمان سے شادی کی۔ بڑے ٹھاکر نے بینڈ باجے اور بگّی کا خرچ اٹھایا۔ دلہن کو چار بنارسی ساڑھیاں دیں۔ نذیرن نے بہو کو بہت کچھ سکھایا۔ محلّے کے ہر گھر کے ریتی رواج، عورت مرد اور بچّوں کے مزاج کی اونچ نیچ، بھٹّی میں کپڑوں کی تعداد کے حساب سے سوڈے کی مقدار، کلف بنانے کا مجرّب نسخہ اور نیل دینے کا گر۔ کلف اور نیل پر نذیرن کو ملکہ حاصل تھا اور بہو کی گانٹھ میں باندھ دیا تھا کہ یہ دونوں چیزیں دھلائی کی بہت ساری کمزوریوں کو چھپا دیتی ہیں۔ کلف اور استری کپڑے کی شان دوبالا کرتی ہے۔ قمیض کے کالر ایسے کڑک ہو جاتے ہیں جیسے پولس اصطبل کے گھوڑے کی گردن۔ کپڑوں پر نمبر ڈالنے کا ہنر بھی بتایا۔ کسی پر چوبارہ، کسی پر ایک ترچھا سا خط کھینچ کر اس کے نیچے یا اوپر تین نقطے بنانا۔ جب کپڑے دھل جاتے رحمت گھاٹ سے گٹھریاں لاتا تو وہ انھیں نشانات کے سہارے بہو سے کپڑے چھانٹنے کو کہتی اور منجھی ہوئی نرم مزاج ساس کی طرح تیوریوں سے بہو کی غلطی پکڑتی اور ناک بھوں چڑھا کے کپڑا اچھال کے کہتی ''نگوڑی۔ کب سیکھے گی سلیقہ؟''

کرم خاں نے اپنے نصیب کو دو چار گالیاں دیں تو نذیرن بھی بھڑک اٹھی۔

''کیوں رمضان میں گالیاں منہ سے نکالتے ہو۔غلطی تمھاری ہے''

بات ایسی نہ تھی کہ ٹھاکر صاحب کو بتائی جاتی۔ چھوٹے کنور صاحب کی چار دھوتیاں آئیں تو اگلے حصہ پر خون اور پیپ کے چھوٹے چھوٹے دھبے تھے۔ مہینہ بھر رحمت ایسا ہی دیکھتا رہا۔ گھاٹ پر بھٹی لگانے سے پہلے اس نے دھوتیاں گپتی لال کو دکھا دیں اور پوچھ بیٹھا کہ یہ کیسے دھبے ہیں۔ گپتی کی زمانہ پرکھی نظروں نے کڑائی سے دھوتیوں کی چھان بین کی اور منہ بنا کر بولا۔

''کنور صاحب گندی عورتوں کے جال میں پھنس گئے ہیں'' اس نے چاروں طرف خوفزدہ نگاہیں اٹھائیں کہ کسی نے سن نہ لیا ہو۔ پھر آہستہ سے کہتا گیا کہ پیشہ کرنے والی عورتیں عیاش مردوں کو ایسا مرض سونپ دیتی ہیں کہ بوٹی بوٹی گل کر ادھڑ جاتی ہے۔ پورے جسم پر پھوڑے ہو جاتے ہیں اور آخر میں مرتیو ہو جاتی ہے۔ رحمت کے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ اسنے بڑا کڑا ہو اٹھایا۔ پانی بھر کے ڈھیر سا سوڈا گھولا اور چھوٹے بانس سے ایک ایک دھوتی اٹھا کر کڑاہو میں ڈال دی۔ اوپر سے لوہے کا ڈھکن رکھ دیا۔ کچھ دیر رحمت کو سکون ملا جیسے اس نے زہریلے ناگ کو پٹاری میں بند کر دیا ہو۔ رات کو تنہائی میں اس نے ساری کہانی کرم خان کو سنائی۔ کرم خاں ہکا بکا رہ گیا۔ دل اور دماغ میں کھلبلی مچ گئی۔ رات بھر بے چین رہا۔ اس نے محل کا نمک کیا کھایا رگوں، میں دوڑتا خون بھی غلامی کے آٹے میں گندھ گیا۔ آقا اور نوکر کا رشتہ بوڑھے شیر اور مینڈکی جیسا ہوتا ہے۔ شیر بھوک میں گھاس نہیں کھاتا لیکن مینڈکی کو نگل جاتا ہے۔ دوسری صبح وہ ٹھاکر صاحب کے قدموں میں جا بیٹھا اور چھوٹے کنور کی دھوتی کھول کے رکھدی۔ کچھ دن بعد چھوٹے کنور کا غصہ آتے جاتے رحمت پر برسنے لگا۔

''کیوں بے دھتیو کے بچے۔ سارا صابون اور سوڈا گھاٹ پر بیچ دیتا ہے''!

ہفتوں یہ سلسلہ یونہی چلتا رہا رحمت ڈر گیا لیکن اسکی بیوی ایسی بے عزتی

برداشت نہ کرسکی۔ صبح شام بنارس چھوڑنے کی ضد کرنے لگی۔ عاجز آکر کرم خاں نے رحمت کو محل چھوڑ دینے کی اجازت دیدی تھی۔

سورج کی کرنیں تاریکی کا تہبند الٹ چکی تھیں۔ کرم خاں دونوں سوٹ ہینگر پر ٹانگ رہا تھا تبھی اسے زوردار چھینک آئی۔ منہ سے بلغم کے بے قابو شریر چھینٹے ٹھاکر صاحب کے کوٹ پر جاچپکے۔ اس کی کمزور آنکھیں قیامت کا عکس نہ دیکھ پائیں۔ نذیرن سے کہا۔

''جا۔ یہ ہینگرس محل میں پہنچا دے'' وہ لڑکھڑاتا پلنگ پر آکر لیٹ گیا۔ تھکن سے چور اور کھانسی سے ذبح کئے مرغ کی طرح پھڑ پھڑاتا اور پھر اس نے آنکھیں موندلیں مگر دھیری آواز میں رحمت کو برا بھلا کہتا رہا۔

''بھدوئی میں لانڈری کھولنے چلا گیا کمبخت!

''پیرس لانڈری کھولیگا۔ سال بھر میں لکھ پتی بن جائیگا اونہہ
ماں باپ کو دغا دے گیا''

اس کے کانوں میں اکلوتے بیٹے کی ڈینگیں رینگنے لگیں۔ پٹرول سے ڈرائی کلیننگ اور بجلی کی استری استعمال کرے گا۔ چمکتے پلائی وڈ کے شوکیس ہونگے۔

''ہاں ہاں اور باپ کا جنازہ سونے کے تابوت پر اٹھائے گا کتے کا پلاّ!'

''باؤلے ہوگئے ہو۔ میرے بیٹے کو کیوں کوستے ہو۔ بھدوئی میں سب سے اِجّت دار دھوبی ہے!'' کرم خاں نیند میں ڈوب چکا تھا۔ اسے پتہ بھی نہیں چلا نذیرن محل سے کب لوٹی اور روٹیاں تھوپنے بیٹھ گئی اس کے دو کمرے محل کے احاطے کے اندر تھے۔ وہاں سے بڑے ٹھاکر کے برآمدے کی سیڑھیوں کا فاصلہ پانچ منٹ کا بھی نہ تھا۔ باہر قدموں کی چاپ سن کر نذیرن نے چولہے کی لکڑیاں باہر کھینچ لیں اور کھڑی ہوگئی دونوں ہاتھ اور انگلیاں آٹے میں بھری ہوئی تھیں دروازہ پر آئی اور بنسی لال اردلی کو دیکھتے ہی بوکھلا گئی۔ کرم خاں اردلی کو یم دوت کہتا تھا۔

''کرمو کہاں ہے؟'' پھٹے ڈھول جیسی آواز میں بنسی لال نے پوچھا''

''بخار میں تپ رہے ہیں!'' نذیرن گردن جھکائے بولی''

''اٹھادو۔ ٹھاکر جی نے بلایا ہے''!

بنسی لال کے جاتے ہی نذیرن پلنگ کی پائنتی پر بیٹھ ہانپنے لگی جیسے میلوں دور سے بھاگتی آئی ہو۔ چولہے کی لکڑیوں سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ اسکا دم گھٹنے لگا۔ وہ برسوں سے بنسی لال کو جانتی تھی۔ محل کے ہرفرد کا منہ چڑھا اور چاپلوس تھا۔ تل کا پہاڑ بنانا بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ کئی بار نذیرن نے بنسی لال کی چغلی پر نوکروں کی چابک سے پٹائی ہوتے دیکھی تھی۔ سب سے زیادہ چابک جنگ بہادر خانساماں نے کھائے۔ اس پر کچن میں کھانے پینے کا الزام ہوتا تھا۔ کباب تلتے وقت دو چار یونہی چٹ کر جاتا۔ دودھ کی بالائی کھالیتا اور ایسا سب کچھ بنسی لال کی آنکھوں دیکھی گواہی کی وجہ سے ہوتا رہتا۔ ایسی شکایتیں سننے کے بعد برآمدہ میں شیر دہاڑتا اور جنگ بہادر کی چیخیں سن کر نذیرن کی چھاتی ڈولنے لگتی۔

''اٹھو۔ اٹھو'' نذیرن نے کرم خاں کی پتلی پنڈلیوں پر ہلکے سے مکّے برسائے۔ کرم خاں نے گھبرا کے آنکھیں کھول دیں مانو کوئی ڈراؤنا سپنا دیکھا ہو۔ لحاف سینہ تک کھسکا دیا۔

''کرم جلی۔ مجھے چین سے مرنے بھی نہ دیگی۔ کیا ہوگیا جو کتیا کی طرح پنڈلی بھنبھوڑ رہی ہے''!

''بنسی لال آیا تھا۔ ٹھاکر صاحب نے بلایا ہے''!

بنسی لال کا نام سنتے ہی کرم خاں کے کمر بند کی گانٹھ کھل گئی۔ چھاتی میں بلغم کے لوتھڑے پنجرہ میں بند چڑیوں کی طرح پھدکنے لگے۔ بڑے ٹھاکر میں راجپوتی آن بان اور رعب دبدبہ ضرور تھا لیکن عمر کے آخری پڑاؤ میں مزاج میں پہلے جیسی گرمی نہ تھی۔ لیکن بنسی لال کو بھس میں چنگاری ڈالنے کی بیماری تھی۔ نہ جانے کیا شکایت کر کے انھیں

بھڑ کا دیا ہو۔ کرم خاں کو ہول اٹھنے لگا۔ کھانسی کے ٹھسکے گننے کی چرخی بن گئے۔۔

''جاؤ نا۔ برکتوں کا مہینہ ہے۔ تسلی رکھو''!

سہمی ہوئی تو نذیرن بھی بہت تھی لیکن صبح فقیر کی صدا سے بیدار ہو گئی تھی۔ اسلئے آس تھی کہ محل میں کوئی انہونی نہیں ہوگی۔ کرم خاں دلاسہ اور حوصلہ پا کے پلنگ سے اترا، چپل پہنی، مفلر باندھا اور باہر نکل گیا۔ خوف اور دہشت سے کھانسی بھی دم توڑتی نظر آئی۔ اسے دس سال پہلے کے ٹھاکر رام پال سنگھ کا انکساری میں بھیگا چہرہ اطمینان دینے آنکھوں میں گھوم گیا۔ چھوٹے کنور کی شادی کو دو سال ہونے کے بعد محل میں بچے کی کلکاری گونجی تھی۔ مگر پوتے کو دیکھ ٹھاکر اور ٹھکرائن دونوں کا دل بیٹھ گیا۔ لاکھوں روپیہ پانچ سال تک لٹایا جوگیوں رشیوں اور مندروں کے سامنے گڑگڑائے لیکن پوتے کے جسم پر بوٹی نہیں چڑھ پائی۔ کھالوں کے نیچے بانس کی پھچپھیوں جیسی ہڈیاں گوشت کو ترستی رہیں۔ پانچ سال کا ہونے کے بعد بھی بچہ ہاتھ اوپر نہیں اٹھا سکا۔ سوکھا میلی نے محل کی ساری خوشیاں چھین لیں۔ کسی دوست نے مشورہ دیا تو ٹھاکر صاحب نے بنسی لال سے کرم خاں اور نذیرن کو بلوا بھیجا۔ اس دن بنسی لال کی آواز میں بانسری کا نچلا سر چلبلا ہو گیا تھا۔

''کرمو دادا۔ ٹھاکر جی نے یاد کیا ہے نجرین بھابی کو بھی ساتھ لانا ہے''!

کرم خاں آرام سے نذیرن کو ساتھ لئے سیڑھیاں چڑھتے برآمدے میں آ کھڑا ہوا۔ ٹھاکر رام پال سنگھ کرسی پر اور ٹھکرائن اپنے پوتے کو گود میں لئے تخت پر بیٹھی تھیں۔ کرم خاں اور نذیرن ہاتھ جوڑے کھڑے تھے۔

''بیٹھو کرمو''۔ ٹھاکر رام پال سنگھ نے اپنے پوتے کی طرف اشارہ کیا اور میٹھی آواز میں سمجھایا کہ محل کی راجپوتی وراثت کے چراغ کی روشنی مدھم نہ ہو۔ نذیرن بچے کو گود میں لیے مسجد کے دروازے پر پانچ وقت کی نماز کے موقع پر پہنچے اور وہیں کھڑی رہے۔ باہر آنے والے ہر نمازی سے بچے پر دم کرنے کو کہے گی۔ مگر کسی کو پتہ نہ چلے کہ ٹھاکر خاندان کی عزّت

نذیرن دھوبن کی گود میں سسک رہی ہے۔ محل چوک کے بیچوں بیچ تھا۔ آگے بانس پھاٹک کے ڈھال سے پہلے مسجد تھی۔ ٹھکرائن نے اپنی پرانی شال نذیرن کو دی اور بچّے کو گلے تک ریشمی ہلکی شال میں لپیٹ کے نذیرن کی گود میں آہستہ سے تھما دیا۔ نذیرن خوش تھی کہ اس اہم فرض نے کرم خاں کو کچھ دن کے لیے پنج وقتہ نمازی بنا دیا۔ ایسا نمازی جو گونگا تھا اور اندھے کی لاٹھی جیسا دائیں بائیں چہرہ گھماتا تھا۔ کرم خاں نے امام صاحب کے مشورے سے قمیض کے کالر اور دھوتی کے کنارے پر بنے چوپارہ کی طرح کلمہ زبان پر ٹانک لیا۔

سورج میں نام کو بھی گرمی نہ تھی۔ پہلی سیڑھی چڑھتے ہی کرم خاں کے پاؤں ٹھنڈ سے جمنے لگے اگلی سیڑھیاں آسماں چھونے لگیں۔ اُس کو اطمینان تھا کہ ٹھاکر کے پوتے پر مسجد میں دم کیا ہوا کلمہ انھیں آج ضرور ٹھاکر صاحب کے غصّے سے محفوظ رکھے گا۔

آخری سیڑھی پر اس کی سانس اکھڑ گئی۔ سامنے کرسی پر ٹھاکر سگریٹ کا دھواں چھوڑ رہے تھے۔ وہ تھکاوٹ اور کمزوری برداشت نہ کر سکا۔ وہیں اکڑوں بیٹھ گیا جیسے خود اپنی قبر میں دو مٹھی مٹی ڈالنے کا ارادہ ہو۔ اس نے بجھی آنکھوں سے دھوئیں کے پیچھے سے دیوار پر لٹکے بھورے رنگ کے چابک کو دیکھا جو سانپ کے طرح اس کے جسم کو لہرا گیا۔ کرم خاں کی سوکھی چمڑی کا بال بال سرسرانے لگا۔ وہ سانس کو قابو میں رکھنے کے لئے چھاتی پر ہاتھ پھیرنے لگا۔

''کرمو! بڑے ٹھاکر کی آواز نے اس کے کانوں کی لووں میں چھید کر دیا۔

''جی سرکار۔ حکم''! بڑے ٹھاکر نے ایش ٹرے میں سگریٹ رکھی اور ہینگر کی طرف اشارہ کیا۔

''میرے کوٹ پر دھبّے کیسے ہیں؟''

کرم خاں نے ماتھے پر ہتھیلی سے چھاؤں کرتے آنکھوں کی پتلیاں نچائیں۔ اسے ٹانگیں وجود کھوتی محسوس ہوئیں۔ ٹخنے سے پنڈلی کے اوپر تک پائجامہ کی بخیہ ادھڑنے کی چٹ چٹ سنائی دی۔ پل بھر احساس ہوا کہ ہینگر پر کوٹ نہیں اس کا لاغر جسم جھول رہا ہے۔ آواز کاغذ کی ناؤ جیسی ڈوب گئی۔

''سرکار۔ رات بہت ٹھنڈ تھی۔ اس کرم جلی نے دو تین اُپلے جلا
دیئے۔ بوڑھی آنکھ سے آنسو کی بوند ٹپک گئی ہوگی۔ معاف کر دیں
مائی باپ''!

''چل چھوڑ۔ ہوش میں آجا۔ گھبرا نہیں اور دھیان سے سن!''

ٹھاکر صاحب کے رویہ میں تبدیلی دیکھ کر کرم خاں کا خوف بھی کم ہوگیا۔ انہوں نے بتایا کہ سورگیہ پتاجی اسے بھدوئی لائے تو پانچ سو گز کا احاطہ دیا تھا۔ اب اس کے دو ہزار روپئے فٹ سے نوے لاکھ میں سودا ہو رہا ہے۔ کنور بابا کو امریکہ پڑھائی کرنے بھیج دیں گے۔ محل کو بھی ٹھیک ٹھاکر کرلیا جائیگا۔ احاطے میں پانچ منزلہ شاپنگ کمپلکس بنیگا۔ کرم خاں کی نظروں میں دس سال پہلے کے ہڈیوں کا ڈھانچہ جیسے نذیرن کی گود سے اچھل کر بہت اونچا اور طاقتور ہوگیا۔ اور نذیرن اس کے بوجھ تلے دب گئی ہو۔

''سرکار سب کچھ آپ کا ہے۔ مجھے حکم دیں''!

''تمھارا خیال رہے گا کرمو''! ابھی رحمت کے پاس بھدوئی چلے
جاؤ۔ کام پورا ہونے پر بلوالونگا''

رات گئے سر پر سامان رکھے محل کے احاطہ سے باہر آکر کرم خاں نے رکشا روکا اور نذیرن کے ساتھ بس اسٹینڈ کی طرف چلدیا سویرے پانچ بجے بھدوئی کے لئے بس روانہ ہونی تھی۔ دونوں ویٹنگ ہال میں بستر کھول اور لحاف اوڑھ کے لیٹ گئے۔ کرم خاں منہ میں چمچہ بھرا اجوائن دبائے سوگیا۔

''مومنو اٹھو۔ سحری کا قت ہوگیا!'' گذری رات کی طرح
نذیرن گھبرا کے جاگ گئی اور کرم خاں کو جھنجھوڑنے لگی۔

''اب اٹھ بیٹھو۔ بس جانے کا وقت ہوگیا''

بس مسجد اور مندر سے دور اور بہت دور ہوتی گئی۔

☆☆☆

گیان کا مندر

سلکن پور کی آبادی ساٹھ ہزار کے قریب تھی۔ وہاں زیادہ تر گنے کی کھیتی ہوتی تھی اور چھوٹے بڑے سبھی کسان گڑ بناتے تھے۔ جس کے انہیں اچھے دام مل جایا کرتے تھے۔ آہستہ آہستہ سلکن پور گڑ کی چھوٹی منڈی بن گیا۔ پنجاب بنک نے وہاں برانچ کھولی تو رمیش پانڈے منیجر ہو کر آیا۔ بنک آجانے سے سلکن پور کے کسانوں کو بڑی راحت ملی۔ چین کی سانس فوج کے صوبیدار سلطان شاہ نے بھی لی کیونکہ انہیں پنشن لینے چالیس کلومیٹر دور تحصیل رام نگر جانا پڑتا تھا۔ اُن کے آگے پیچھے کوئی نہ تھا۔ دو بیٹے تھے۔ دونوں لکھنؤ میں سرکاری ملازم تھے۔ اُن کے بال بچے بھی وہیں تھے۔ پانچ ایکڑ زمین اور اکیلی جان۔ ایک پندرہ سال کا لڑکا اختر ملازم رکھ لیا تھا۔ صبح شام اختر کی ماں آکر کھانا بنا دیا کرتی تھی۔ سلطان شاہ کی ایک آنکھ میں موتیا بند بگڑا تو لاکھ علاج کے بعد روشنی نہ آسکی۔ دوسری آنکھ سے بھی کم دکھائی دیتا تھا۔ تنہائی نے بیمار بھی کر دیا۔ سب سے پہلا کام انہوں نے یہ کیا کہ پنشن سلکن پور کے بنک میں ٹرانسفر کرالی۔ مہینہ کی دوسری تاریخ کو وہ اختر کے ساتھ پنشن لینے آجاتے۔

ایک بار رمیش پانڈے نے سلطان شاہ کو اپنے کمرے میں بلایا اور دھیمی آواز میں کہا

"صوبیدار صاحب۔ یہ آپ کا نوکر بڑا بے ایمان ہے!"

"کیوں کیا ہو گیا؟"

سلطان شاہ نے پوچھا۔

"وہ کاؤنٹر سے نوٹ لیتا ہے اور چپکے سے پچاس روپیہ کا ایک نوٹ اپنی جیب میں رکھ لیتا ہے"۔

''اچھا۔اچھا! سلطان شاہ نے مسکراتے ہوئے اتنا ہی کہا اور اُٹھ کر باہر آ گئے۔ وہ راستہ بھر اختر کے ساتھ باتیں کرتے اپنے کھیت پر لوٹ آئے۔ رمیش پانڈے سلکن پور میں تین سال رہا اور برابر اختر کی چوری دیکھتا رہا۔ اُس نے بوڑھے اور بیمار سلطان شاہ کو ہمیشہ مسکراتے ہی دیکھا۔ جب اُس کا وہاں سے تبادلہ ہوا تو سلطان شاہ سے ملنے گھر گیا۔ کافی دیر تک دونوں میں باتیں ہوتی رہیں۔ چائے پیتے وقت رمیش پانڈے نے سلطان شاہ کو مشورہ دیا۔

''آپ کی عمر کافی ہوگئی ہے۔ اپنے بیٹوں کے پاس کیوں نہیں چلے جاتے۔ دیکھ ریکھ ہو جائے گی!''

سلطان شاہ اداس ہو گئے۔ اُن کی نظر بہت کمزور ہو گئی تھی۔ تخت پر بیٹھے بیٹھے کھیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولے

''وہ دائیں طرف پیپل کے نیچے دو قبریں دکھائی دے رہی ہیں۔ ایک میری ماں کی ہے اور دوسری ابا جان کی۔ مجھے بڑا اطمینان ہے وہ دونوں میرے ساتھ ہیں''۔

سلطان شاہ نے بتایا ابا جان اور ماں دونوں خود ہل چلاتے تھے۔ بُوائی کرتے اور اپنے ہاتھوں سے فصل کاٹتے۔ مجھے پانچویں تک پڑھایا اور پھر مجھے کام پر لگا دیا۔ اٹھارہ برس کا ہوا تو تحصیل میں فوج والوں نے بھرتی کیمپ لگایا۔ ابا ساتھ لیکر گئے۔ اُن کی دعاؤں سے نوکری مل گئی۔ سلطان شاہ کی کہانی سننے کے بعد رمیش پانڈے نے اُٹھتے اُٹھتے انہیں اختر جیسے چالاک اور بے ایمان سے ہوشیار رہنے کو کہا۔ سلطان شاہ ہمیشہ کی طرح ہنس کر خاموش ہو گئے۔

وقت گزرتا گیا اور سلکن پر بھی بڑھتا گیا۔ وہاں کی آبادی دو لاکھ سے اوپر ہو گئی تھی۔ رمیش پانڈے لکھنؤ بنک کا بڑا افسر بن گیا تھا۔ اسی دوران سلکن پور کی پنجاب بنک شاخ میں پانچ لاکھ کا غبن ہو گیا۔

منیجر نے پولس میں شکایت کی اور پولس کیشئر کو پوچھ تاچھ کے لئے تھانے لے گئی۔ جب یہ خبر بنک کے لکھنؤ دفتر میں پہونچی تو بنک نے رمیش پانڈے کو معاملہ کی جانچ کرنے سلکن پور

بھیجا۔

رمیش پانڈے سلکن پور پہنچا اور پُرانے گُرمنڈی کا بدلا ہوا نقشہ دیکھ کر حیران رہ گیا۔ کچے مکانوں کی جگہ دو منزلہ عمارتیں، ڈامر کی سڑکیں اور بجلی سے جگمگاتی دوکانوں کا جال بچھ گیا تھا۔ لوگوں نے اُسے بتایا کہ سرکار نے بنک کے ذریعہ کسانوں کو دل کھول کر قرضے دیئے۔ کھاد بیج اور کھیتی کے نت نئے سامان خرید لائے۔ گنے کی پیداوار بڑھ گئی۔ تحصیل کے شوگر مل گنے کی اچھی قیمت دینے لگے۔ اس طرح سرکار کے ساتھ کسانوں نے بھی سلکن پور کی ترقی میں بڑھ چڑھ کے حصہ لیا۔ یوں چمتکار ہوا اور گھر گھر خوشحالی اور شانتی نے بسیرا کرلیا۔

رمیش پانڈے نے اپنے ایک دوست سے صوبیدار سلطان شاہ اور اُس کے نوکر اختر کے بارے میں پوچھا تو اُسے پتہ چلا۔

''اُن کا انتقال ہوگیا۔ ۸۵ سال کی عمر پائی''!

''وہ اختر اور کھیتی کی زمین کہاں گئی؟ رمیش پانڈے نے پوچھا

''سلطان شاہ کے بیٹوں نے بیچ دی۔ اُن کا مکان اختر نے خرید لیا۔ آپ اس سے جا کر ضرور ملیں''۔ دوست کا جواب سن کر رمیش پانڈے کے دماغ میں ہلچل پیدا ہوئی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ جو لڑکا چور اور بے ایمان تھا اس نے سلطان شاہ کا مکان کس طرح خرید لیا۔ بنک میں جانچ پڑتال کے بعد رمیش پانڈے نے پکا ارادہ کرلیا کہ وہ اختر سے ضرور ملے گا۔

دوسرے دن صبح نو بجے رمیش پانڈے نے اختر کا پتہ پوچھا اور پیدل اُس کے گھر کی طرف چل دیا۔ گُرمنڈی سے کوئی تین کلومیٹر کے فاصلے پر ٹین کا شیڈ بنا ہوا تھا۔ تین طرف اینٹ کی دیوار جس میں ہوا کے آنے جانے کے لئے کھڑکیاں تھیں۔ سامنے لکڑی کا بڑا سا دروازہ تھا اور بغل میں بورڈ جس پر موٹے حروف میں لکھا ہوا تھا

''سلطان شاہ یادگار اسکول''

رمیش پانڈے کی آنکھیں چکا چوندھ ہونے لگیں۔ اُس نے دونوں ہتھیلیوں سے آنکھوں کو خوب مسلا۔ کئی بار بورڈ کو پڑھا اور کچھ دیر گُم صم کھڑا رہا۔ اپنی حیرانی قابو میں کر کے وہ

دروازے کے اندر آ گیا۔ زیادہ بڑا ہال نہ تھا۔ پھر بھی اُس میں لگ بھگ بیس چھوٹی بڑی لڑکیاں ٹاٹ پر بیٹھی تھیں۔ اُن کے ہاتھوں میں پینسل کاپیاں تھیں۔ بلیک بورڈ کے سامنے رمیش پانڈے کی طرف پیٹھ کئے شاید ماسٹر جی کھڑے تھے۔ سفید کھادی کا کُرتہ پائجامہ اور سر پر مخمل کی کالی ٹوپی پہنے تھا۔ رمیش پانڈے زور سے کھنکارا تو ماسٹر جی نے مُڑ کے دیکھا۔

''اے بھگوان۔ یہ تو وہی ہے۔ اختر ''چور''۔

رمیش پانڈے دل ہی دل میں بڑبڑایا۔ دس سال بعد بھی ویسا ہی دُبلا پتلا اور مسکراتا چہرہ!۔ اختر قریب آیا اور پوچھا۔

''کون ہیں آپ۔ کیسے آنا ہوا؟''

رمیش پانڈے ایک ہی سانس میں بولتا گیا کہ وہ پنجاب بنک میں دس سال پہلے منیجر تھا۔ بنک میں صوبیدار سلطان شاہ پنشن لینے آتے تھے۔ اختر سب کچھ سمجھ گیا اور بول اُٹھا

''جی ہاں۔ پہچان گیا۔ آپ نے سلطان جی سے میری شکایت کی تھی کہ پنشن میں سے پچاس روپے چرا لیتا تھا''۔

رمیش پانڈے کا سر شرم سے جھک گیا۔ اختر نے اُسے بتایا کہ اُس نے اُسی ڈھنگ سے پونجی اکٹھا کی۔ کسانوں سے بھی چندہ لیا اور لڑکیوں کا اسکول کھول لیا۔ رمیش پانڈے نے کھسیاتے ہوئے پوچھا۔ ''مگر تم نے لڑکیوں کا ہی اسکول کیوں کھولا''؟

اختر نے مسکراتے ہوئے بتایا کہ اگر خود اس کی ماں نے تعلیم حاصل کی ہوتی تو وہ زیادہ پڑھائی کر لیتا۔ ماں کی گود علم کا گہوارہ ہوتی ہے۔ آج کی پڑھی لکھی لڑکی کل ماں بنے گی تو گھر میں اپنے بچے کو لکھنے پڑھنے کے قابل بنا سکتی ہے۔

رمیش پانڈے کا چہرہ آنسوؤں سے بھیگ گیا۔ اختر کو سینہ سے لگایا اور پُرانے الزام کی معافی مانگی۔

☆☆☆

چمتکار

کوشلیا اور نرنجن پلیٹیں، ڈونگے اور چمچے دھونے میں کڑکتی سردی کی چُبھن کا احساس بھول گئے۔ ذائقہ دار کھانے کی خوشبو گرم پانی کے ٹب میں گھلتی جارہی تھی۔ زیادہ تر مہمان جاچکے تھے اور رسمیں پوری ہوچکی تھیں دلہن بدا ہوکے اپنے بَر کے ساتھ پھولوں سے سجی ماروتی کار کی طرف بڑھ رہی تھی۔ وہ سب کچھ ہورہا تھا جو صدیوں سے ہوتا چلا آیا ہے۔ نرنجن شہر کے نامی ہوٹل مالک ویرومل کا ملازم تھا۔ شہر اور آس پاس کے شادی بیاہ میں کھانے اور سجاوٹ کے لیے ویرومل کا بڑا شہرہ تھا۔ ایسے سمارودہ میں نرنجن اپنی دس سال کی بیٹی کو محلہ والوں کی نگرانی میں کمرہ میں چھوڑ کوشلیا کو ساتھ لے آتا تھا۔ سو (۱۰۰) روپے بھی مِل جاتے اور قسم قسم کا کھانا بھی۔ پوری، کچوری، تندروی روٹی، مٹر پنیر، دم آلو اور سبزی پلاؤ۔ کوشلیا پولی تھین کی تھیلی میں بچا کھچا اتنا سمیٹ لیتی کہ نرمل بیٹی اور خود دونوں کے لیے ایک دودن کی خوراک ہوجاتی۔ ویرومل کے ویٹرس اور دوسرے ملازم زمین پر فرش بچھائے بھوک مٹانے کو تیار بیٹھے تھے۔

۲؍دسمبر کی سردی سے ٹھٹھرتی رات ۳؍دسمبر میں داخل ہوئی کہ اچانک عجب بو فضا میں پھیلتی گئی۔ یہ بُو دارچینی، جائفل اور دوسرے مسالوں جیسی فرحت افزاء نہ تھی۔ دھوئیں جیسے دھندلے مرغولے نے ملازمین اور براتیوں کے سینے میں دھڑکتے دلوں کو بے چین کردیا۔ وہ کھانس رہے تھے اور ہتھیلیوں سے آنکھیں مسلتے انجانے خوف سے گھر گئے۔ باہر سڑک پر ہزاروں قدموں کی دھمک نے سیٹھ مگن لال کی قمقموں سے روشن کوٹھی کو ہلا کے رکھ دیا۔ باراتیوں میں بھگدڑ مچ گئی۔ دھوئیں نے بجلی کے ننھے ننھے بلبوں

کو نگل لیا اور بڑی ٹیوب لائٹس بھی دھند میں ڈوب گئیں۔ باراتی، رشتہ دار، مہمان عورتیں اور بچے ہوش وحواس چھوڑ باہر کو دوڑ پڑے۔ دلہن کا نسوانی لوچ اور رنگ برنگی چوڑیاں جو کچھ منٹ پہلے سہاگ کو دوبالا بنا رہی تھیں پل بھر میں پھیکی پڑ گئیں۔

''ہائے رام'' کوشلیا کی لڑکھڑاتی آواز نرنجن کے کانوں میں سرسرائی اور غائب ہوگئی۔ نرنجن نے اونی مفلر منہ اور کانوں سے لپیٹ رکھا تھا۔ وہ برتن چھوڑ کھڑا ہوگیا۔ فرش پر کھانے کے لیے بیٹھے ویٹرس کو اوندھے پڑا دیکھ کے اس کی سانس رکنے لگی۔ سڑک پر کہرام بڑھتا گیا چاروں طرف چیخ پکار اور ہاہا کار تھی۔ ہزاروں لوگ ایک دوسرے کو روندتے اندھا دھند سر اٹھائے بھاگ رہے تھے۔ مانو آدم خور شیروں کا جھنڈ ان پر جھپٹنے دوڑا آرہا ہو۔

''جان بچاؤ۔ بھاگے چلو''

کچھ ہیروٹائپ کے نوجوان بلند آواز میں چلّاتے کوٹھی کے سامنے سے دوڑتے گئے۔

''بھاگو۔ زہریلی گیس کے کنوئیں پھٹ گئے۔''

زندہ رہنا ہے تو شہر چھوڑ دو!''

نرنجن دھیرے سے کوشلیا کے پاس آیا۔ ٹھنڈی انگلیوں سے اسے ٹٹولا اور چاہا کہ ہاتھوں میں اٹھالے لیکن کوشلیا برف کی سِل بن گئی تھی۔ نرنجن نے چھاتی پر گھی تیل سے چپڑے دونوں ہاتھ پھیرے مگر کوئی کپکپاہٹ محسوس نہیں ہوئی۔ ہمت کر کے اس نے کوشلیا کی کمر پکڑ کے اٹھانے کی کوشش کی تو گردن ایک طرف ڈھلک گئی۔

''ہے بھگوان۔ یہ تو شانت ہوگئی!''

وہ بڑبڑایا اور مایوسی سے سر گھمایا۔ کوٹھی اور لان ویران ہو چکے تھے۔ کہیں کہیں انسانی جسم بکھرے دکھائی دیئے جیسے پت جھڑ میں زرد بے جان پتے تیز ہوا کے تھپیڑوں سے ٹوٹ کر ادھر ادھر پھیلے پڑے ہوں۔ جہاں بینڈ باجوں کی مستانی دھن پر زندگی تھرک رہی تھی۔ عورتوں کے جنونی قہقہے، بچّوں کی کوئل جیسی کلکاریاں اور نشہ بکھیرنے والے

سینٹ کی مہک پھیلی ہوئی تھی۔اب وہاں ساری رونق اور خوشیوں کے گلدستے مرجھا گئے تھے۔زنجن نے سوچا اسے فوراً گھر جانا چاہیئے۔معصوم بچی دہشتناک افراتفری دیکھ دیوانی ہوگئی ہوگی۔آس پڑوس والے بھی گھربار چھوڑ کے جا چکے ہونگے۔ایشور جانے نرمل پر کیا بیتی اور اس کا کیا حشر ہوا ہوگا۔جب کوشلیا نے زہریلی بو کے آگے ہتھیار ڈال دیئے تو دس سال کی بچی کی کیا اوقات!ماں جن جن گھروں میں جھاڑو پونچھا اور کپڑے دھونے جاتی وہ بھی انگلی تھامے ساتھ ہولیتی۔بڑی ڈرپوک اور دھان پان۔بارش کے دنوں میں بجلی کڑکتی تو اس کی زبان لٹک جاتی اور آنکھیں پھیل جاتیں۔کوشلیا کی چھاتی سے لپٹ کر ہی شانتی ملتی۔رات کو بلّی کی میاؤں میاؤں اور کتوں کے بھونکنے سے اٹھ بیٹھتی۔بلک بلک کے روتی۔اب زنجن کو بیٹی کی فکرستانے لگی۔

''وہ بھوکی ہوگی'' زنجن نے پولی تھین میں تھوڑا سا کھانے کا سامان رکھا اور پانی کی سیل بند دو بوتلیں اٹھائیں۔یہ پانی امیر لوگ پیتے ہیں۔صاف ستھرا ہوتا ہے اور کہتے ہیں صحت بناتا ہے۔محلّہ کے نلوں سے کئی بار چھوٹے چھوٹے کیڑے بھی نکلے۔نرمل تو ہیضہ میں مرتے مرتے بچی تھی۔ایسا صاف شفاف پانی نرمل نے کبھی نہیں پیا۔وہ منڈپ کے پاس آیا۔کسی کا ریشمی سفید اسکارف اور دبیز اونی شال کرسی پر رکھی دیکھی اور جھجکتے ہوئے ہاتھ میں دبوچ لی۔اسکارف سے آنکھیں ڈھانپیں اور شال اوڑھ لی۔کچھ خیال آیا اور تیزی سے کوشلیا کی طرف لپکا شال اُتاری اور لاش پر پھیلا دی۔

''کتنی ٹھنڈ ہے۔مُردے کو بھی لگتی ہے''

وہ کوٹھی سے باہر آگیا ایسی بھاگم بھاگ اس نے جیون میں کبھی نہیں دیکھی تھی۔بوڑھے مرد،عورتیں اور بچے جگہ جگہ فٹ پاتھ پر گرے پڑے ہائے توبہ مچا رہے تھے۔کوئی انھیں دیکھنے سننے والا نہ تھا۔گلا پھاڑ کے اپنوں کو آوازیں دے رہے تھے۔ہندو، مسلم، سکھ اور عیسائی سب دریا کی طغیانی جیسی رفتار سے جدھر راستہ ملتا ادھر کو دوڑ لگا رہے تھے۔زنجن کو تین سال پہلے کا نربدا ندی کا سیلاب یاد تھا۔طرح طرح کے

زہریلے سانپ اور بے بس انسان ایک ہی درخت سے لپٹے تھے۔ وہ کاٹنا بھول گئے اور آدمی ڈرا نہیں کیونکہ حقیقی موت پانی تھا زہر نہیں۔

''باوا۔ ادھر آؤ۔ میں یہاں ہوں''

''چاچا۔ مجھے اُٹھالو۔ میری آنکھیں جل رہی ہیں''

''بھیّا مجھے پانی دو۔!

زنجن نے پانی کی بوتل کی ناب توڑی اور اس ضعیف عورت کی طرف بڑھادی جس نے بھیا کہہ کر اسے پکارا تھا۔

''بہن۔ ان بچوں کو بھی پلا دینا''

زنجن کے کانوں میں نرمل کی کمزور آواز دستک دینے لگی۔ جس میں خوف اور لاچاری تھی۔ زنجن دوڑتے دوڑتے ہانپنے لگا۔ بیڑی سگریٹ نے اس کے پھیپھڑوں کو مدھوکھی کا چھتہ بنادیا تھا۔ اسی لمحہ اسے خیال آیا کہ گھر کے آس پاس زیادہ تر آبادی مسلم رنگریزوں کی تھی۔ چار مسجدیں تھیں اور محلہ میں مشکل سے دس گھر ہندوؤں کے تھے۔ پچھلے سال قریب کی بستیوں میں دنگا بھی ہوا تھا۔ کہیں رنگریز اس آپادھاپی میں بدلہ لینے کا منصوبہ نہ بنالیں۔ گھر تھوڑے فاصلہ پر رہ گیا تھا۔ زنجن نے برے اندیشہ کو جھٹک دیا۔ سوچا نرمل جاگ رہی ہوگی۔ ہمیشہ سے ایسا ہوتا رہا ہے۔ وہ کوشلیا کے ساتھ شادی بیاہ میں جاتا تو کھانا ساتھ لے کے آتا اور نرمل پلیٹ ہاتھ میں لیے بیٹھی ملتی۔ اس کے کمرہ کے باہر اور چاروں طرف کے گھروں میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ زنجن کا دل بیٹھ گیا۔ کمرہ کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ سامنے سڑک کے کنارے کوئی بیٹھا تھا اور اسے دیکھ کر بکری جیسی منمناہٹ میں بولا۔

''اے بھائی۔ پانی پلا دو''!

زنجن قریب پہونچا اور حیرت سے سٹپٹا گیا۔ لال مسجد کے مولوی صاحب سر پکڑ بُرے طرح کھانس رہے تھے۔ بغل میں کوئی عورت بے سدھ اوندھی پڑی تھی۔ شاید ان کی بیوی تھی۔ موت کے تانڈو میں بھی چہرہ پر دوپٹہ سے پردہ کیے ہوئے تھیں۔ کسی نامحرم

نے برسوں اُن کے بالوں کی ایک لٹ نہ دیکھی ہوگی۔ زنجن نے تھیلی سے پانی کی بوتل نکالی اور سیل توڑ کے مولوی صاحب کے لرزتے ہاتھوں میں تھما دی۔

''مولوی صاحب۔ میری بیٹی نرمل بھی کہیں نظر آئی!

مولوی صاحب نے گردن ہلاتے مسجد کی طرف اشارہ کیا۔ بوتل کا ایک قطرہ بھی حلق میں نہ ڈال سکے بوتل ہاتھ سے گری اور وہ وہیں ڈھیر ہوگئے۔ زنجن گھبرایا ہوا مسجد کے دروازہ پر آیا۔ کچھ دیر سوچتا رہا کہ اندر جانے سے ہنگامہ نہ ہوجائے اور لینے کے دینے پڑ جائیں۔ گئے سال کا فسادنگاہوں میں لوٹ آیا۔ پتنگ کٹ کے آئی اور مسجد کے صحن میں آگری۔ پرشادی لال اور گنگا سنگھ کے بچے ننگے پاؤں اسے اٹھانے اندر گھس آئے تھے۔ زنجن پس و پیش میں پڑ گیا۔ چاروں طرف خاموشی تھی۔ کتے بلی بھی نظر نہ آئے۔ اس نے چپلیں اتاریں۔ سر پہ بندھے اسکارف کو کھولا اور پیر کے تلوے صاف کئے اور جلدی سے صحن میں آگیا۔ اسکارف کو فرش پر بچھایا اور پولی تھین تھیلی میں سے سارا کا سارا کھانا انڈیل دیا۔ اس نے بارہا دیکھا تھا۔ رمضان میں نت نئی افطاری چادر پر سجائی جاتی اور ارد گرد روزہ دار گولہ چھوٹنے کا انتظار کرتے تھے۔ زنجن کو وہاں صرف چھوٹی چھوٹی چمگادڑیں اڑتی دکھائی دیں۔ نہ جانے مولوی صاحب نے گردن گھما کے کیسا اشارہ کیا تھا۔ حجرہ میں بلب کی روشنی تھی۔ اس نے آہستہ سے دوبار آواز لگائی۔

''نرمل۔ نرمل'' خاموشی چھائی رہی۔ اس کے دل کی دھڑکنیں تیز ہوگئیں۔ ہمت کر کے حجرہ کی کنڈی کھولی دس بارہ بچے سردی سے بچنے کے لیے ایک دوسرے سے لپٹے آرام سے سو رہے تھے۔ دو لڑکوں کے سینوں پر سیپارے رکھے تھے۔ پڑھتے پڑھتے سو گئے ہونگے۔ ایک کونے میں نرمل گنگا سنگھ اور پرشادی لال کے لڑکوں پر نظر پڑی تو زنجن بھونچکا رہ گیا۔ سرتھامے اُکڑوں بیٹھے خوش ہوا کہ یہ دیوی دیوتاؤں کا چمتکار ہے۔ تبھی اسے مولوی صاحب اور اُن کی بیوی کا خیال آیا۔''ہائے رام۔ اصلی چمتکار اُن ہی کا تھا''۔ وہ تیزی سے اٹھا اور حجرہ کا درواز بند کر کے باہر کود پڑا۔

☆☆☆
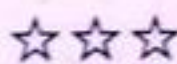
پناہ گاہ

وہ کُل بیس تھے۔ بارہ مرد اور آٹھ عورتیں۔ رام دیال نائک چھ مہینے پہلے آئے تھے۔ ان کے روم پارٹنر ڈپٹی کلکٹر رمیش شریواستو تھے۔ بڑے صحن کے درمیان دس فٹ لمبی اور چار فٹ اونچی دیوار کا پارٹیشن تھا۔ باقی کھلے میدان میں لکڑی کی کچھ بنچ اور کرسیاں پڑی تھیں۔ اس طرف دس کمرے اور دوسری طرف پانچ کمرے تھے۔ ہر کمرے میں دو بیڈ، مچھر دانی اور چھت میں پنکھا، سائڈ میں دو ٹیبلیں بھی لگائی گئی تھیں۔ نائک اکیلے کھلے میدان میں صبح شام چہل قدمی کرتے۔ دوسرے منھ بسورے لیٹے رہتے۔ جیسے بہت تھکے ماندے اور اُکتائے ہوئے ہوں۔ ان میں نہ کپڑے بدلنے کی رغبت تھی اور نہ ہی بال سنوارنے کی خواہش۔ نہاتے ضرور تھے۔ آنکھیں فرش کو تاکتی رہتیں مانو کسی دفینے کی تلاش ہو۔ پروفیسر نائک نے ان سب میں ایک بات یکساں پائی کہ پت جھڑ کے موسم میں بے پناہ اداس اور غمزدہ ہو جاتے۔ کمرے میں لیٹے لیٹے صحن میں بکھرے اور ہوا میں اڑتے زرد پتوں کو دیکھتے اور ٹھنڈی آہیں بھرتے۔ کبھی جب آس پاس کے گھروں سے معصوم صداؤں کی بازگشت گونجتی اور احاطے میں داخل ہوتی تو وہ بے چین ہو جاتے۔ چڑیوں کی مستی بھری چہچہاہٹ اور مرغوں کی دلنشیں بانگ ان کے کان کے پردوں سے ٹکرا کر انھیں وحشت میں مبتلا کر دیتی۔

ایک دن رات بھر دھواں دھار پانی برسا اور بجلی بار بار کڑکتی رہی۔ بادلوں کی گرج سے ماحول میں اُجاڑ پن تھا۔ لائٹ چلی گئی اور کمروں میں گھٹا ٹوپ اندھیرا چھا

گیا۔ پروفیسر نائک کو احساس ہوا کہ رمیش شریواستو ڈپٹی کلکٹر بیڈ سے اتر کر چپل ڈھونڈ رہے ہیں۔

''کیوں کیا ہوا رمیش جی؟ تاریکی میں کہاں جانے کی تیاری ہے۔''

تبھی لائٹ آ گئی۔ رمیش شریواستو کی آنکھیں نم تھیں۔ وہ بتانے لگے۔ ''جب کبھی بارش میں ٹور پر گیا راتوں کو نیند اڑ جاتی۔ واپسی کے لئے رکنا پڑتا کیونکہ ندی طغیانی میں پُل سے اوپر بہہ رہی ہوتی تھی۔ مکان کی ایک دیوار اور چھت بہت شکستہ تھی۔ بیٹا دیر رات تک پڑھتا ہے۔ ٹور کے دوران جاگتا رہتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ ایشور اس کی رکھشا کرے۔

''چلیئے آپ لیٹئے۔ آپ کا اپنا مکان ہے؟''

''جی ہاں۔ میرے دادا نے پِتا جی کو دیا تھا۔ بہت پرانا ہے۔ میرے بیٹے نے توڑ کر شاندار ڈپلیکس بنگلہ بنا لیا ہے۔''

دس کمروں میں قیام کیے ہوئے زیادہ تر وہ ہوگ تھے جو سماج اور انتظامیہ میں ایک معزز درجے کے مالک تھے۔ دیوار کی دوسری طرف مقیم عورتوں کے بارے میں وہ کچھ نہیں جانتے تھے۔ سنیچر کو آسمان کھُلا ہوا تھا۔ سورج کی آب وتاب سے درختوں اور گھاس پودوں سے بارش کے قطرے خشک ہو چکے تھے۔ پروفیسر نائک کئی دنوں سے کھلے میدان کی ایک بنچ پر آرام کرتی اس عورت کو دیکھ رہے تھے۔ عمر جو بھی رہی ہو۔ لیکن سرخ سفید کتابی چہرہ غزالی آنکھیں اور ستواں ناک میں وہ پھول کی مانند بکھری نظر آئی۔ دائیں گال پر موٹا تل سورج کی کرنوں کی چھاؤں میں کسمسائے بیتے لمحات کے بوجھ تلے کانپ سا رہا تھا۔ اسی تل نے پروفیسر نائک کے دماغ میں کھلبلی مچائی تھی۔ ان کا دل سوالات کے گورکھ دھندے میں الجھ گیا۔ یادداشت کی ٹھنڈی راکھ میں سسکتی چنگاریوں کو کریدنے کی کوشش میں وہ کئی رات جاگتے رہے۔

ماسٹر رام دیال نایک ہائر سیکنڈری اسکول میں انگریزی پڑھاتے اوب چکے تھے ۔ دس سال سے ایک ہی کتاب اور گرامر کی گردان سے تنگ آکر انہوں نے ماسٹر جی کا بے حد ہنگم لبادہ اتار پھینکنے کی پرتگیا کی ۔ انگریزی لٹریچر میں برسوں پہلے ایم اے کیا تھا۔شہر کے کئی وکیل انگریزی ڈرافٹنگ کی نوک پلک سنوارنے ان کے گھر آیا جایا کرتے تھے ۔ گڈ فرائیڈے پر چرچ میں تقریر کرنے سے ہفتہ بھر پہلے فادر جیکب مقدس انجیل سینے سے لگائے ماسٹر نائک کے پاس آن دھمکتے ۔ گھنٹہ بھر ان سے باتیں کرتے اور نرم لہجے میں ایک دو پیراگراف لکھ دینے کی التجا کرتے ۔

''ایسا کچھ لکھ دیں ماسٹر جی کہ سننے والوں کے دل میں تیر کی طرح الفاظ پیوست ہو جائیں ۔وہ انسانوں سے پیار کرنا سیکھیں''

انہوں نے پی ایچ ڈی کی زور شور سے تیاری شروع کر دی ۔ شریمتی نرملا نائک پرانے رسم و رواج والے دقیانوسی خاندان سے آئی تھیں ۔ جب جب گھر کے کام کاج سے فرصت پاتیں اگربتی سلگا کر رامائن پڑھنے بیٹھ جاتیں ۔ بیٹی کی شادی کے سلسلے میں صبح شام شِو مندر میں گلاب کے پھول اور ناریل چڑھانے گئیں ۔ ایشور کا کرنا ایسا ہوا کے سال بھر میں دہلی میونسپل کارپوریشن کے واٹر ورکس انجینئر کے لڑکے سے شادی پکی ہوگئی ۔لڑکا اسی کارپوریشن میں اوورسیئر تھا۔اب رہ گیا ماسٹر جی کا بیٹا مہیش نائک جو بی ۔اے ۔کرنے کے بعد نوکری کی تلاش میں جوتیاں چٹخاتا پھر رہا تھا۔اس کے معاملے میں نرملا نائک کے پھول اور ناریل بیکار ثابت ہوئے ۔ پریشانی کے اس دور میں سہارنپور سے ایلومنیم برتنوں کے بڑے بیوپاری دوارکا پرشاد رتلام آئے ۔ ماسٹر جی سے پرانی سلام دعا تھی ۔ بات چیت کے دوران وہ مہیش نائک پر لٹو ہو گئے ۔میاں بیوی کو راضی کر لیا اور دوسرے دن کپڑے لتّے سوٹ کیس میں بھر کے مہیش کو سہارنپور لے گئے ۔

ماسٹر رام دیال نائک نے ڈیڑھ سال میں پی ایچ ڈی کا مقالہ پیش کر دیا۔ دو مہینے بعد انہیں پی ایچ ڈی ایوارڈ ہوگئی۔ اسی سال صوبائی پبلک سروس کمیشن نے لیکچرار کے عہدوں کے لیے اشتہار جاری کیا۔ دو صفحہ کا لمبا چوڑا درخواست کا فارم ماسٹر جی بھرنے ٹیبل کرسی پر بیٹھے تو نرملا نائک نے ہاتھ میں رامائن تھام لی۔ وہ اپنی بیوی سے بہت محبت کرتے تھے۔ مہیش کے سہارنپور چلے جانے اور پھر دوارکا پرساد اگروال کا خاموشی سے اس کا اپنی بیٹی سے بیاہ کر دینے کی خبر جب ماسٹر رام دیال نائک کو ملی تو نرملا نائک کافی اداس رہنے لگی تھیں۔ صحت بھی دن بہ دن گرنے لگی۔

''تم جا کر سو جاؤ۔ میں فارم بھر لوں۔ آخری تاریخ میں ہفتہ رہ گیا ہے۔''

نرملا نائک کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ کانپتی لرزتی آواز میں وہ دل کا غبار نکالنے لگیں۔ انھیں یہ فکر کھائے جا رہی تھی کہ ان کی مرتیو کے بعد ماسٹر جی کا کیا ہوگا۔ وہ اکیلے کیسے رہیں گے۔ رنڈوے مرد کی حیثیت فوٹو فریم میں جڑی اس تصویر جیسی ہوتی ہے جس کی آنکھیں اور کان تو ہوتے ہیں مگر زبان نہیں ہوتی۔ مہیش پانچ سال میں ایک بار آیا تھا۔ دس لاکھ کی ٹاٹا سفاری کار سے اترا۔ ماسٹر جی اسکول گئے ہوئے تھے۔ مشکل سے پانچ منٹ گھر میں رکا۔ پلنگ پر بیٹھا بھی نہیں۔ نرملا بہت گڑگڑائیں۔ روئی بلبلائیں۔ اپنے دودھ کا واسطہ دیا کہ وہ شام تک ہی ٹھہر جائے۔ مگر مہیش نہیں پسیجا۔ نرملا اپنے مقدر پر آنسو بہاتی رہیں اور مہیش جھٹ پٹ باہر نکل گیا۔ معلوم ہوتا تھا اس چھوٹے کمرے میں اس کا دم گھٹ رہا ہو۔

''نرملا۔ تم خواہ مخواہ پریشان رہتی ہو۔ اچھے ڈاکٹر تمہارے علاج کر رہے ہیں۔ بھگوان نے چاہا جلدی ٹھیک ہو جاؤ گی۔''

جس دن اُن کا اپائنٹمنٹ لیٹر آیا، نرملا کے پاؤں خوشی سے تھرک اٹھے۔ ان

پر اتھناؤں نے کٹھن منزل پالی تھی۔ وہ اپنے ماں باپ کی اکلوتی بیٹی تھیں۔ شادی کے پانچ سال تک انہوں نے مائیکے کی تاک جھانک کی۔ پھر کبھی پلٹ کے نہیں گئیں۔ بچپن سے بڑا ہونے تک کی یادیں، ماں کی دلار بھری گود اور باپ کے لاڈ پیار کا تصور بھی انکے دل میں طوفان نہ اٹھا سکا۔ انہوں نے رام دیال نائک کی بانہوں، پیار چھلکاتی آنکھوں، معمولی تنخواہ اور بیٹا بیٹی کی پرورش کو اپنے جیون کا مقصد بنالیا تھا۔

نرملا کے پاس سونے کی آٹھ چوڑیاں تھیں۔ ماسٹر نائک کو ڈگری کالج کے پروفیسر کا روپ دھارن کرنا تھا۔ انہوں نے چار چوڑیاں بیچ دیں اور دو سوٹ، چار شرٹ سلوائیں، نئے جوتے اور ٹائی خریدی۔ گھر کے دروازے پر پروفیسر ڈاکٹر رام دیال نائک کی نئی نیم پلیٹ بھی سج گئی۔

پروفیسر رام دیال نائک گورنمنٹ ڈگری کالج کے زینے کی پہلی سیڑھی چڑھتے وقت یہ نہیں بھولے کی نرملا نائک شو مندر مندر کی اٹھارہ سڑھیاں دو بار گربھ وتی رہتے آٹھ ماہ تک چڑھتی رہیں۔ مہیش کی زچگی سے چھ دن پہلے ان کی سانس پھول گئی۔ انہوں نے پانچویں سیڑھی پر پھولوں کی تھالی رکھ دی۔ کچھ دیر ماتھا ٹیکا اور پھر ہانپتی کانپتی گھر لوٹ آئیں۔

پروفیسر نائک پل بھر کو رکے۔ دل ہی دل دعا کی کہ نئی عمارت میں نئے عہدے پر ان کی عزّت بنی رہے۔ پرنسپل کے کمرے میں جوائننگ رپورٹ دینی تھی۔ بڑے ہال اور اونچے کھمبوں کے نیچے وسیع گیلری پار کرتے دبلے پتلے، گورے چٹے درمیانی قد اور چاکلیٹی سوٹ ٹائی میں وہ شاید اچھے لگ رہے ہونگے۔ لڑکیوں کے جگہ جگہ جھرمٹ میں سے صراحی دار گردنیں اور شبنمی آنکھیں ادائے دلبری کے ساتھ ان کی طرف یوں اٹھنے لگیں جیسے ہوا کے جھونکے میں کوکا کولا کی خالی بوتل وہاں آگری اور فرش پر لڑھک رہی ہو۔ اسٹوڈینٹس کونسل کی سکریٹری ریکھا میر چندانی اپنی سہیلیوں کے ساتھ وہاں گپیں لڑا رہی تھی۔ نوٹس بورڈ سے لے کر لڑکے لڑکیوں کی کتابوں میں سینٹ کی خوشبو میں بے

محبت ناموں تک کی خبر اسے رہتی تھی۔ پروفیسر نائک کو آتے دیکھ وہ بولی۔

''مجھے رام دیال نائک معلوم پڑتے ہیں۔ انگریزی کے نئے لیکچرار۔ ان کے اپائنٹمنٹ کی ایک کاپی نوٹس بورڈ پر چسپاں ہے''

پروفیسر نائک زیرلب مسکراتے ہوئے آگے بڑھتے گئے۔ انہوں نے ٹی وی پر لڑکیوں کو نت نئے لباس اور فیشن میں دیکھا تھا۔ مگر آج نئے کالج میں خوشبو میں نہائے نسوانی جسموں کا تنگ جینس اور ٹی شرٹ میں ہلکورے لیتے منظر نے لمحہ بھر کو انہیں جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ نگاہیں نیچی کیے وہ پرنسپل ملہوترا کے کمرے میں داخل ہو گئے۔ پہلے دن حاضری لیتے وقت ان کا ریکھا میر چندانی سے بھرپور تعارف ہوا۔ گلاب جیسا کتابی چہرہ، مخروطی سرخ ہونٹ۔ جیسے پھولوں کا رس چوس کے آئے ہوں۔ شانے پر لمبے سیاہ بال جن کا آدھا حصّہ سینے کو ڈھانکے ہوئے تھا۔ وہ کلائی میں سونے کی آٹھ جڑاؤ چوڑیاں، انگلی میں نیلم کی انگوٹھی اور گلے میں سنہری نیکلس پہنے تھی۔ کئی دن بیتنے کے بعد پروفیسر نائک اس نتیجہ پر پہونچے کہ حسن و دولت نے ریکھا کو نہ صرف پرکشش بلکہ مغرور بھی بنا دیا ہے۔ پروفیسر ملہوترا نے جب انہیں ڈرامیٹک سوسائیٹی کا نگراں مقرر کیا تب ریکھا کے نازنخروں سے انکا واسطہ پڑا اور قدم قدم پر اس کے دماغ کو ساتویں آسمان پر گردش کرتے پایا۔ وہ ایک ماڈرن اور تعلیم یافتہ گھرانے سے تعلق رکھتی تھی۔ اس کا باپ پی ڈبلوڈی کا مشہور ٹھیکیدار تھا۔

پروفیسر رام دیال نائک کا تقرر ایک سال کے لئے ایڈہاک بنیاد پر ہوا تھا۔ یہ معیاد پوری ہونے میں مہینہ بھر باقی تھا۔ پرنسپل ملہوترا انکی کارکردگی سے بہت خوش تھے۔ اور یہ امید کی جا رہی تھی کہ تسلی بخش کام کے پیش نظر پروفیسر نائک کو کنفرم کر دیا جائے گا۔ جنوری میں کالج کی سالانہ تقریب ہونی تھی۔ پروفیسرس کمیٹی اور اسٹوڈنٹس کونسل نے شاندار کلچرل پروگرام کی روپ ریکھا بنائی۔ پروفیسر نائک کی ہدایت میں شیکسپئر کا ڈرامہ ہیملیٹ، اسٹیج کرنے کی بات فائنل ہوگئی۔ ریاست کے گورنر

نے مہمانِ خصوصی کے طور پر شرکت کرنے کی منظوری دے دی تھی۔ بیس دن میں سب کچھ انجام دینا تھا۔ پروفیسر نائک نے کرداروں کے انتخاب کے لئے ایک پورا دن آڈیشن کے لیے طے کیا۔ انہوں نے پہلے بادشاہ، ملکہ، ہیملیٹ اور ہوریشیو کے سلیکشن کے لیے ہر کردار کے دو دو امیدوار کو مکالمے دیئے۔ ملکہ کے ڈائیلاگ ناہید جہاں نے بخوبی انجام دیئے۔ لیکن ریکھا میر چندانی کے لہجے میں سندھی ٹون مصیبت بن گیا۔ جبکہ ملکہ کے کردار کے لئے وہ اپنے آپ کو سب سے زیادہ موزوں سمجھتی تھیں۔ لیکن پروفیسر نائک کی نظروں میں ناہید جہاں زیادہ بہتر تھی اور اس کا انتخاب بھی فائنل کر لیا۔ ریکھا بھڑک گئی اور ''دیکھ لوں گی'' کہتے ہوئے غصے میں باہر چلی گئی۔ اس کے رویہ سے سب حیران تھے۔ ریکھا میر چندانی نے ہر طرح کے ہتھکنڈے استعمال کر لیے۔ مقامی ایم ایل اے سے پرنسپل ملہوترا پر دباؤ ڈالا گیا۔ اس کا سب سے یہی کہنا تھا کہ پروفیسر نائک کو کالج میں آئے جمعہ جمعہ آٹھ دن ہوئے ہیں وہ یہاں کے طلباء کی صلاحیتیں کیا خاک جانیں۔ لیکن ریکھا کی بھاگ دوڑ اور سفارشیں رنگ نہیں لائیں۔ سالانہ تقریب کو صرف دو دن باقی تھے۔ تیاریاں آخری مرحلے پر تھیں۔ پولس بینڈ کی دھن پر این سی سی کیڈٹ گورنر کو گارڈ آف آنر دینے کی مشق کر رہے تھے۔ کونسل کے صدر نے اپنی تقریر پوری طرح رٹ لی۔ سکریٹری کی حیثیت سے ریکھا میر چندانی کو بھی خطاب کرنا تھا۔ لیکن وہ ہیملیٹ کی ماں ملکہ کی طرح بے عزتی کا زہر پینے کی ہمت نہیں جٹا پا رہی تھی۔ تقریب سے ایک رات قبل ریکھا اپنے بیڈروم سے باہر آئی۔ تصور میں ہیملیٹ کو مخاطب کیا۔

''یہاں آؤ رام دیال نائک۔ میرا رومال لے کر اپنی پیشانی
پونچھ لو۔ ملکہ تمھارا جامِ صحت پی رہی ہے''

وہ جب وزیر تعلیم کے بنگلے پر کار سے اتری تو اس کو یقین ہو گیا کہ وہ اپنی اسکیم میں میاب ہو گئی۔

پروفیسر رام دیال نائک کا تقرر رائیڈ ہاک تھا۔ سروس رولس کے تحت ایسے سنگین معاملے میں وبھاگیہ جانچ کے بغیر ان کی سروس ختم کر دی گئی۔ نرملا نائک کو یقین نہیں آیا۔ کوئی جلتے توے پر بیٹھ کر بھی ایسا گھناؤنا الزام لگاتا تو وہ بھروسہ نہیں کرتیں۔ ماسٹر رام دیال نائک کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہے۔ گھر سے باہر نکلنا بند کر دیا۔ نرملا نے بیٹے مہیش کی بے رخی اور سسرال میں بس جانے کے بعد سے ہی پھیپھڑوں میں روگ بسا لیے تھے۔ اپنے شوہر کے بے عزتی کے صدمے سے ان کا دل پھٹ گیا اور ہفتے بھر میں وہ شانت ہو گئیں۔ مہیش نے ماں کی چتا کو اگنی دی۔ دوسرے دن استھیاں سمیٹ لایا اور نربدا میں وسرجن کر سہارنپور لوٹ گیا۔ تیرھویں میں بھی شریک نہیں ہوا۔ رام دیال نائک نے چھاتی پر پتھر رکھ لیا اور جان لیا کہ درخت سوکھتا ہے تو پتے بھی جدا ہو جاتے ہیں۔ انہوں نے جوار بھاٹے کی طرح عروج و زوال بھوگ لیا تھا۔ نرملا کی چھوڑی سونے کی چار چوڑیاں کرتے کی جیب میں رکھیں جو اب ان کی رگِ جاں کا لہو بن گئیں تھیں۔ دروازہ کھلا چھوڑ تیز تیز قدموں سے باہر نکل گئے۔

اس عورت کو کھلے میدان کی بینچ پر بیٹھے دیکھا تو رام دیال نائک کے دماغ میں ہلچل سی مچ گئی۔ انہوں نے اس کے قریب جانے کا اٹل ارادہ کیا۔ کھونٹی سے کرتا اتار کر پہنا اور دھیرے دھیرے میدان کی طرف چل دیئے۔ دو دن کی بارش کے بعد سورج نکلا تھا۔ سات بج رہے تھے۔ ان کے کبھی پڑوسی اور روم پارٹنر رمیش شریواستو گہری نیند میں سو رہا تھا۔ کچن میں برتنوں کی کھڑکھڑاہٹ سے پتہ چلا کہ چائے اور ناشتے کی تیاری ہو رہی ہے۔ رام دیال نائک بنچ کے نزدیک پہنچے تو عورت چونکی اور مڑ کر انہیں دیکھا۔ پتلی کمزور کلائیوں پر موٹی موٹی رگیں، گال پچکے ہوئے، آنکھوں میں ویرانی اور گردن کا گوشت لٹکا ہوا تھا۔ رام دیال نائک خاموشی سے اس کے سراپا کا جائزہ لینے کے بعد ایک دم چیخ اٹھے۔

"تم۔۔۔تم۔۔۔ریکھا میر چندانی۔ یہاں کیسے؟"

عورت کے خشک ہونٹوں سے کمزور آواز نکلی۔

''اوہ۔آپ۔آپ۔پروفیسر رام دیال نائک؟''

وہ حیرت سے اٹھی اور لڑکھڑا گئی۔

''کہاں کا پروفیسر؟ شیکسپیئر کی ہیلمیٹ کی ملکہ نے ماسٹری بھی چھین لی۔پتنی اور بیٹا بھی جدا کر دیا۔مگر تم۔۔؟''

رام دیال نائک نے ریکھا کے کانوں کے ٹاپس، گلے کا نیکلیس اور ہاتھوں میں جڑاؤ چوڑیوں کو تلاش کیا تو وہ پھوٹ پڑی۔آواز گلے میں پھنس گئی۔ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں اپنے کھوٹے نصیب کا دکھڑا رویا۔رام دیال نائک بھی جذباتی ہوگئے۔انہوں نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور نرملا نائک کی یادگار چاروں چوڑیاں نکالیں اور آنکھیں جھکا کر ریکھا کے دائیں ہاتھ میں پہنادیں۔

''چلو اٹھو''

وہ اس کا ہاتھ پکڑے اوپر آئے اور پھر بیرونی گیٹ سے سڑک پر آگئے۔ انہوں نے مڑکر سورج کی دمکتی کرنوں میں گیٹ پر لگے بورڈ پر نظریں ڈالیں۔

''نہرو وردھا آشرم''

دونوں کا رخ شہر جانے والی سڑک کی طرف ہوگیا۔

☆☆☆

چیلیں

گردن کیسی بھی ہو۔ پتلی یا موٹی۔ کسی کی بھی ہو۔ ہندو کی، مسلمان یا سکھ عیسائی کی۔ آسمان کی طرف اُٹھتی ضرور ہے۔ چاند ستارے دیکھنے، ست رنگی دھنک اور جیٹ جہازوں کے کرتب کا نظارہ کرنے کے لئے آنکھیں اور گردن پر بیٹھا سر ہر قیمت پر اوپر ضرور اُٹھے گا۔ دنیا جہاں کے مالک سے رحم اور پناہ کی بھیک تو اُسی انداز میں مانگی ہوتی ہے۔ سوکھے بنجر کھیتوں کی بھوک پیاس مٹانے مانسون کی تلاش میں لاکھوں اربوں گردنیں آسمان کو تاکتی ہیں۔ اتوار کی چھٹی تھی۔ کالونی کے کمیونٹی ہال میں چھوٹے بڑے افسر جمع تھے۔ ہم افسروں کا معمول تھا کہ جب کبھی تعطیل ہوتی وہاں اکٹھا ہوتے، ٹی۔ وی پر فلموں کا لطف اُٹھاتے، شطرنج کی بساط جمتی، کیرم بورڈ پر گوٹیں ٹکراتیں اور ملک کے ہر گرم مسئلہ پر بحث ہوتی۔ لنچ کے بعد وہاں شام تک لڑکوں کی سرگرمیاں جاری رہتیں۔ اُس دن ساؤتھ افریقہ اور بھارت کا ایک روزہ میچ تھا۔ میں نے ٹی۔ وی کھولا تو سب کے چہروں پر مایوسی چھا گئی۔ اعلان ہوا کہ رات بارش ہو جانے کی وجہ سے میچ ایک بجے شروع ہو سکتا ہے۔ مسٹر اڈپٹی ڈائرکٹر انڈسٹریز انگڑائی لیتے ہوئے بولے

''نیازی صاحب۔ کوئی نیوز چینل ہی لگا دیں''

انڈیا ٹوڈے پر بریکنگ نیوز کا شور اُٹھا۔ وہ خوش نصیب ہندوستانی صنعت کار دُنیا بھر کے دولت مند تاجروں کی قطار میں چوتھے نمبر کا امیر ترین قرار دیا گیا۔ اُس دھن پتی کا ممبئی میں نو تعمیر بادلوں کو چھوتا بلند محل بھی دکھایا جا رہا تھا۔ پتہ نہیں ۱۲۰ کروڑ کی آبادی میں سے کتنی انسانی گردنیں اور سر فخر سے اونچے ہوئے ہوں گے۔ مجھے وہ دن

یاد آیا جب پوکھرن میں کامیاب ایٹمی دھماکوں کے بعد دیش کے کونے کونے میں شہنائیوں نے خوشی کے راگ بکھیرے تھے۔ مجھے حیرت نہیں ہوئی کہ افسروں کی گردنیں کٹھ پتلی کی طرح اوپر کو تن گئیں۔ چھت کی طرف نہیں بلکہ ٹی۔وی اسکرین کی طرف۔ جب کہ آنکھیں اور ٹی۔وی ایک ہی سطح پر تھیں۔

''او مائی گاڈ''۔ پٹوڑے پی۔ ڈبلو۔ ڈی انجینیر کے منہ سے چیخ نکلی جیسے انھوں نے کوئی عجوبہ دیکھ لیا ہو۔ ''یہ تو قطب مینار سے بھی بیس گُنا اونچی ہے''۔ میں بھی آنکھیں پھاڑے اس انوکھی عمارت کو تک رہا تھا۔ میرا ایسا انداز بچپن میں تین بار ضرور ہوتا تھا۔ رمضان، میٹھی اور بقرعید کا چاند دیکھنے خود اپنی چھت پر گھر بھر کے افراد کے ساتھ آسمان کے مغربی کونے کی تاک جھانک کرتا تھا اور کچھ دیر بعد سارے محلے کے بچے چیخ چیخ کا آسمان سر پر اُٹھا لیتے۔

''چاند دِکھ گیا۔ چاند دِکھ گیا۔ کل عید ہے''

لیکن آج ہال میں خوشی کا ویسا کوئی اظہار نہیں تھا۔ بس حیرت تھی کہ ممبئی ہی کیا دنیا بھر میں ایک خاندان کے رہنے بسنے کے لئے اتنی اونچی اور قیمتی عمارت بنانے کی دیوتائی شکتی کسی کو نصیب نہیں ہوئی۔ ٹاٹا گھرانہ جس نے کارخانہ شبد سے اُٹھتے دھوئیں کو مٹھی میں بھینچ کر الہ دین کا چراغ بنایا۔ بڑے کارخانے کھڑے کئے۔ لاکھوں کو روزگار دیا۔ دیش کا پہلا ماڈرن ہاسپٹل بنایا جہاں آج بھی کینسر جیسے موذی مرض سے دو دو ہاتھ کرنے ہر ہندوستانی ممبئی بھاگتا ہے۔ اس نے اپنے عیش و آرام کے لئے چوتھے امیر جیسا محل نہیں بنایا۔ ٹی وی پر یہ بھی بتایا کہ اِس دھن پتی نے ۲۷ منزلہ اہرام کو مکمل کرنے پر چار ہزار پانچ سو کروڑ روپیہ پانی کی طرح بہا دیا۔

کمیونٹی ہال وَن ڈے میچ کو بھول گیا۔ ممبئی کی قطب میناری حویلی نے سیاسی دھواں اُگل دیا۔ میں خاموش نہ رہ سکا۔ بول پڑا کہ ڈھیروں پانچ سالہ یوجناؤں کے بعد بھی سرکار ۸۰ فیصدی لوگوں کو سر چھپانے کے لئے چھت نہیں دے سکی۔

''چھت چھوڑیئے نیازی صاحب۔ دیہاتوں میں پینے کا پانی، اسکول اور دوا دارو بھی نصیب نہیں''۔

نہنے سنگھ بھدوریہ نے سگریٹ کا لمبا کش لگایا۔ ٹی۔وی کا والیوم کم کرنے کا اشارہ کیا اور بولے

''اتنی لاگت میں کتنے ہی تاج محل بن جاتے۔ نہیں تو ممبئ کی آدھی جھونپڑپٹیوں کی جگہ فلیٹ کھڑے ہو جاتے''۔

ہم لوگ آدھے گھنٹے اِس نادر محل پر بات چیت میں گزار گئے۔ ہر ایک افسر کے تبصرے بہت دلچسپ اور ببول کے کانٹوں سے زیادہ نوکیلے تھے۔ مجھے دل ہی دل میں ہنسی بھی آئی کیونکہ اسسٹنٹ لیبر کمشنر تھا۔ دفتر کی فائلوں پر نوٹ شیٹ تیار کرتے وقت کسی محکمہ کے افسر کے قلم میں اُن کے دماغ میں ہمدردی کی ایسی روشنائی نہیں ہوتی جو آج چوتھے امیر کی خبر دیکھ کر فاقہ زدہ مزدور، لاچار کسان اور اسکول دوا دارو کی لچھے دار باتیں کر رہے تھے۔

''چار چھ تاج محل گنگا، نربدا اور کرشنا ندی کے کنارے، چاندنی رات میں جگمگاتے تو ساری دنیا شاہجہاں اور ممتاز محل کو بھول جاتی''۔

میرے والد ریلوے میں انجینئر تھے۔ فائلوں کا ذکر ہوا تو بتاتا چلوں کہ پلیٹ فارم پر ٹرین جس پٹری پر رُکتی ہے اُسے لُوپ لائن کہتے ہیں۔ سگنل ملنے پر آگے بڑھتی ہے۔ اسٹیشن چھوڑ کر پوائنٹ سے جب گزرے گی وہاں زوردار ''کھٹ'' کی آواز گونجے گی۔ ریلوے کا تکنیکی اسٹاف کھٹاک کی آواز کے پوائنٹ کو یوں کہتا ہے ''راجدھانی ایکسپریس'' ''کانٹا'' پار کر مین لائن پر آ گئی۔ اِسی ریلوے سسٹم سے سرکاری دفتر میں فائل چلتی ہے۔ نچلی ٹیبل سے اگلی اور پھر بڑی ٹیبل کے ''کانٹے'' سے گزر کر منتری، مکھیہ منتری کے پاس یعنی ''لُوپ لائن'' پر آ کے ٹھہر جاتی ہے۔ ۲۷ منزل کے محل والے دھن پتی نے بھی اِس لائن پر رُکی فائل کا سگنل برسوں سے اپنے ہاتھ میں رکھا ہوگا تبھی تو دفینہ ڈھونڈ لایا۔ غریبی کیا دور ہوگی۔ امیر کو امیر ترین

بنانے کے پلان بنتے رہیں گے۔

ایک بجے ٹی۔وی پھر بولا کہ ابھی میچ شروع ہونے میں گھنٹہ بھر لگ سکتا ہے۔ امپائر پچ کا معائنہ کریں گے۔ میں کرسی سے اُٹھا۔سب سے معافی مانگی۔ پرسوں بقرعید تھی۔ بکرا ابھی خریدنا تھا۔مہینہ بعد ملازمت سے ریٹائر ہو رہا تھا۔عید کے دن سب کو الوداعی ڈنر کی دعوت دیتا ہوا کمیونٹی ہال سے باہر آ گیا۔ بزرگوں نے پیمانہ بتایا تھا کہ باون تولہ چاندی یا اُس کی قیمت کی ملکیت پاس ہو تو قربانی کرتے رہنا۔خود کبھی شریعت کی کتابیں اور عیدین کے مسائل پڑھنے کا موقعہ نہیں ملا۔ جب جب قربانی کی تو تسلی ہوئی کہ جسم کے ہر جزو کا بدلہ ادا ہو گیا۔ ابا جان کہتے تھے کہ اللہ نے بکرا بکری میں بھرپور برکت دی ہے سال میں دو بار جنتی ہے۔کروڑوں ہر روز کاٹے جاتے ہیں پھر بھی کمی نہیں آتی۔ کالونی میں میرا کوئی ہم مذہب نہیں تھا۔ لے دے کے دفتر کا چھوٹا بابو ستار خاں آٹے میں نمک کی حیثیت سے موجود تھا۔ کالونی سے ایک کلومیٹر دور کرایہ کے چھوٹے سے کمرہ میں رہتا تھا۔شادی نہیں ہوئی تھی۔ اتر پردیش کے کسی دیہاتی علاقہ سے اُس کا تعلق تھا۔ جہاں عام طور سے تبلیغی جماعت کی گاہے بگاہے آمد سے شریعت کا چراغ ایک دو دن کے لئے روشن ہو جاتا۔ تیسرے دن جماعت جانے کے بعد گاؤں کا چھوٹا سا طبقہ پھر اُس پوسٹ کارڈ جیسا ہو جاتا جس پر ڈاک خانہ کی مہر ضرور لگی ہوتی لیکن خط کا مضمون پڑھنے کی اہلیت کسی کو وراثت میں کبھی نہیں ملی۔ میرے سامنے کوئی شرعی مسئلہ آنکھیں دکھاتا تو میں ستار کو سائکل پر شہر کی جامع مسجد روانہ کر دیتا۔ وہ امام صاحب کے سامنے ٹوپی پہنے ادب سے بیٹھ کر مشکل کا حل دریافت کرتا۔ واپس آتا اور بنگلہ کے لان میں اس انداز سے امام صاحب کا جواب بیان کرتا مانو وہ مجھے محکمہ کے شوکاز نوٹس کی اونچ نیچ سمجھا رہا ہو۔

بنگلے آیا تو ستار وہاں موجود تھا۔ بیگم سے روپے لئے اور ستار کو تھماتے ہوئے ہدایت دی۔

'' ٹھونک بجا کے بکرا خریدنا۔ دو دانت کا ہو۔ کوئی جسمانی عیب نہ ہو۔ تندرست اور فربہ ہونا چاہئے''۔ میرا اردلی پورن بھی اُس کے ساتھ ہولیا۔ شام چھ بجے ہوں گے کہ ستار آٹو میں کالے رنگ کا تگڑا بکرا لے آیا۔ وہ اور پورن اُسے پکڑے بیٹھے تھے۔ بڑی مشکل سے دونوں نے نیچے اُتارا۔ بل دار سینگ اور دو ڈھائی انچ کی داڑھی تھی۔ بالکل منگول لڑاکو نظر آرہا تھا۔ بنگلہ کے پچھلے لان میں اندھیرا تھا۔ کالونی میں میرے لئے یہ پہلی قربانی تھی۔ اس لئے محتاط رہا کہ کسی کی دل آزاری نہ ہو۔ ستار اور پورن سے اُسے گیراج میں باندھنے کو کہا۔ ستار نے بڑے فخر سے بتایا کہ بازار میں قریشی سماج کے سربراہ نے بکرے کے دانت دیکھے۔ گردن، کمر، دست، ران اور پیٹ پر کئی بار ہاتھ پھیرنے کے بعد دعویٰ کیا تھا

'' ستار بھائی۔ غضب کا کنبہ پرور جانور ہتھیایا ہے۔ خدا کی
قسم ۲۵ کلو سے اوپر ہی نکلے گا گوشت۔ چربی کا بھنڈار ہے۔
ہانڈی میں گھی ڈالنے کی ضرورت نہیں پڑے گی''۔

کڑاکے کی سردی پڑ رہی تھی۔ بکرے کو موسم کی مار سے دو رات محفوظ رکھنا تھا۔ ستار نے پورن کی مدد سے اُسے گیراج میں باندھ دیا تھا۔ وہ بے حد نٹ کھٹ، جوشیلا اور مست مولی ٹائپ کا جانور تھا۔ آنکھوں میں شباب کی لالی اور جسم میں بجلی سی بھری تھی۔ گرج دار آواز میں سینکڑوں فتنے مچل رہے تھے۔ اُس کی بے ہنگم اچھل کود سے میں سمجھ گیا کہ گاؤں کی آزاد کھلی فضا سے تازہ تازہ شہر آیا ہے۔ بکریوں کے جمگھٹ میں چھیل چھبیلے موالی کی طرح چھیڑ خانی میں مصروف رہتا ہوگا۔ اسی لئے گیراج کی قید تنہائی اور گردن کی موٹی رسی کے پھندے نے اس کے شہوانی جذبات کو بے چین کر دیا تھا۔ وہ گلا پھاڑ کے چیخ رہا تھا اور میرے ہوش اُڑے جا رہے تھے کہ کالونی کے افسران کی پیشانی پر ناگواری کی چنگاریاں چٹک رہی ہوں گی۔ وہی ہُوا جس کا ڈر تھا۔

رات کے ابتدائی لمحات میں پڑوسیوں کے فون آنے شروع ہوئے کہ سونا حرام

ہو گیا۔ مشرا ڈپٹی ڈائرکٹر نے کڑا اعتراض کیا۔ اُن کا آٹھ مہینے کا پوتا خوف سے روئے جا رہا ہے۔ پوتی بار بار نیند سے اُٹھ بیٹھتی ہے۔ چیختی ہے ''دیو آ گیا۔ دیو آ گیا''۔

''نیازی صاحب۔ بکرا لائے ہیں کہ پاگل ہاتھی۔ پلیز کچھ بندوبست کریں''۔ ایک دوسرے آفیسر نے تلخ لہجہ میں طنز کیا۔

''ارے بھائی۔ فارگا ڈسیک۔ بکرے کے سائلنسر لگوا دیں''۔

مجھے تشویش ہوئی کہ ابھی سے کشیدگی کا ماحول بن رہا ہے۔ بیگم بھی گھبرا گئیں۔ آپس میں مشورہ کیا اور اردلی پورن کو جھٹ پٹ بلایا۔ نرمی سے پابند کیا کہ اپنا پلنگ گیراج میں لگالے اور وہیں رات گزارے تا کہ انسانی ہمسائیگی کی تراوٹ سے بکرا سکون پا جائے۔ بڑے برتن میں چنے اور پیپل کی پتی کا ڈھیر لگا دیا۔ خدا کا شکر ادا کیا۔ ترکیب کام آئی۔ دو تین بار بکرا ممنایا اور پھر خاموشی چھا گئی۔

اب سکون سے دوسری الجھن پر غور کیا۔ پرسوں قصائی کا انتظام کرنا تھا۔ عام قصائی کو پندرہ پندرہ دن پہلے ایڈوانس رقم دیکر بک کرنا پڑتا ہے۔ ریلوے ٹکٹ کی طرح۔ ڈھونڈے نہیں ملتے۔ آس پاس کے گاؤں سے گونڈ بھیل بھی نیا روپ لئے شہر کے خاص خاص چوراہوں پر آ بیٹھتے ہیں۔ ایک دو روپلی کروشیا والی ٹوپی سر پر اور میلا کرتا پائجامہ پہن لیا۔ ایک تھیلی میں دھار کی ہوئی دو چار چھریاں باندھ لیں اور بن گئے ''ڈپلی کیٹ قصائی''۔ ستار نے مجھے ان حالات سے آگاہ کر دیا تھا۔ یہ لوگ جنگلوں میں بد جناور کاٹتے ہیں اور خوب دعوت اُڑاتے ہیں۔ ستار مولوی صاحب سے معلوم کر آیا تھا کہ کلمہ پڑھ کے خود ذبح کریں اور باقی کام بہروپیہ کو کرنے دیں۔ قربانی ہو جائے گی۔ اس کام سے بھی مطمئن ہو جانے کے بعد سونے کے لئے لیٹ گیا۔ بس کل کی رات بکرے کی خدمت اور کی جانی تھی۔ بری طرح تھک گیا تھا اس لئے نیند بھی خوب آئی۔ کمیونٹی ہال کا دن بھر کا تماشہ، دھن پتی کا ۲۷ منزلہ محل، اور ون ڈے میچ کے انتظار سے پھسلتا خوابوں کا سفر برفیلی چوٹیوں پر ٹھہر گیا۔ چاندی سی آب و تاب میں وہ محل جنت کو

شرماتا نظر آیا۔ اغل بغل میں چھوٹی چھوٹی چوٹیاں مانو ہاتھ جوڑے ادب سے کھڑی تھیں۔ محل کے وسط میں عالیشان ہال تھا جس کی دیواریں لعل و زمرد سے دمک رہی تھیں۔ درمیان میں جواہرات سے آراستہ سونے کا تخت تھا۔ ہلکی ہلکی موسیقی گونج رہی تھی۔ ایسا لگا جیسے امارت کا نیا سورج غربت کی پیشانی پر انگارے برساتا اُبھر رہا ہو۔ تبھی سونے کے مرصع تخت کے پیچھے زرتار پردے میں جنبش ہوئی۔ حاجب نے تین بار مینا کار گنگا جمنی تخت پر عصا مارا اور آواز لگائی۔

''نگاہِ رُوبرو۔ خداوند زمین و زماں۔ حضور شاہ عالیجاہ۔

قارونِ ملک ہندوستان۔ نگاہ رُوبرو''۔

اس کے بعد چاروں طرف سیاہ بادل چھا گئے۔ گھٹا ٹوپ اندھیرے میں چاندی کا محل اور سونے کا تخت سب کچھ گم ہوگیا۔ ایسا کچھ دیر رہا۔ تھوڑی دیر بعد معلوم ہوا بہت سے سورج نکل آئے۔ کرنیں آگ اُگلنے لگیں اور پلک جھپکتے دھرتی کی طرف اُن کا رُخ ہوگیا۔ آنا فانا شہروں میں کیڑے مکوڑوں جیسی رینگتی جھگی جھونپڑیاں راکھ کے ڈھیر میں تبدیل ہوگئیں۔ بکرا انتہائی خوفناک آواز میں چیخا اور میری نیند کُھل گئی۔ میں آنکھیں ملتا ہوا اُٹھا اور خواب کی گہرائیوں میں جھانکنے کی ناکام کوشش کی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ آج لیبر کورٹ میں میرے اجلاس پر گوئل اسٹیل فیکٹری اور وہاں کے مزدوروں کا کیس پیش ہونا تھا۔ کل عید کا بوجھ بھی سامنے تھا۔ اپنے پی۔اے کو فون کردیا کہ پیشی کی اگلی تاریخ لگادے۔

دوسری صبح جامع مسجد سے آکر قربانی کا فریضہ ادا کیا۔ کمیونٹی ہال میں برتن بھجوائے۔ منرل واٹر کی بوتلیں اور گلاس رکھوائے۔ ڈنر میں ویج اور نان ویج کا انتظام تھا۔ تمام سامان آچکا تھا۔ ستار خاں باورچی اور اُس کے کارکنوں کو لینے شہر گیا ہوا تھا۔ کالونی کے افسران عید ملنے آجا رہے تھے۔ دن کے ایک بجے آرام کرنے کی فرصت ملی۔ سوچا لیٹ لوں۔ چپل اُتاری اور بیڈ پر بیٹھا تھا کہ باہر سے آواز آئی۔

''چار بوٹی دیدے۔ بھوک لگی ہے''۔ میں خوشی سے جھوم اُٹھا۔ پہلی بار کالونی میں بنگلہ کے باہر کسی فقیر نے صدا لگائی۔ تیزی سے کھڑکی کے پاس آیا۔ پردہ اُٹھا کر جھانکا تو ساری خوشی کافور ہوگئی۔ وہ ایک برہنہ سادھو نما بھکاری تھا۔ سر کے الجھے سفید بال، چھوٹی سی داڑھی، کوئلہ جیسا سیاہ رنگ، گال اندر کو دھنسے ہوئے اور آنکھیں سفید پلکوں سے ڈھکی ہوئیں۔ بچپن میں دادی نے کہانیوں میں مرگھٹ کے بھوت کا جو ڈراونا حلیہ بتایا تھا یہ بھکاری ہو بہو ویسا ہی تھا۔ میرے جسم میں سنسنی پھیل گئی۔ بیگم بھی پاس کھڑی تھیں۔ وہ خوف سے دور ہٹ گئیں۔ بھکاری نے پیلے گندے دانت نکالے

''دیدے۔ دیدے۔ بکرا نہیں مانگ رہا۔ چار بوٹی کا سوال ہے''۔ میں نے بیگم سے پولی تھین کی تھیلی میں تھوڑا گوشت رکھ لانے کو کہا۔ وہ گوشت تو لے آئیں مگر منہ بنا کر ناگواری سے بولیں

''دیکھتے نہیں وہ ہندو بھکاری ہے۔ قربانی کا گوشت کیسے دیدیں؟

''وہ سائل ہے۔ کوئی بات نہیں۔ خالی ہاتھ لوٹانا بھی گناہ ہے''۔ میں نے کھڑکی میں سے ہاتھ بڑھایا اُس نے لپک کر تھیلی میرے ہاتھ سے چھین لی اور لاٹھی ٹیکتا آگے بڑھ گیا۔ مجھے بڑی تسلی ہوئی۔ اطمینان کی سانس لی کہ قربانی تکمیل پا گئی۔ رمضان میں سائل کی آواز کو ترستے رہے۔ تہوار اور خوشی کے موقعہ پر بھوک اور افلاس کو مذہب کی کسوٹی پر پرکھنا ایسا ہی ہے جیسے بھینگی آنکھ سے پھن اُٹھائے سانپ کو دیکھنا۔ بیگم ابھی بھی ناک بھوں چڑھائے تھیں اور میں دیر تک دقیانوسی روایات سے دور رہنے کی تاکید کرتا رہا۔

ایک گھنٹہ بیتا ہوگا کہ بیگم نے میرے تھکے ماندے جسم پر پھوہڑپن کا پٹاخہ پھوڑ دیا

''ہائے اللہ۔ ڈنر کے لئے سویٹ ڈش بنانا تو بھول ہی گئی''۔

میرے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے۔ رٹائرمنٹ ڈنر کا سوال میری ۳۲ سالہ شاندار ملازمت کی آن بان سے جڑا ہوا تھا۔ آفیسر اپنے اپنے محکمہ میں اعلیٰ عہدوں پر

تھے۔ کار سے پاؤں نیچے رکھنا توہین سمجھتے تھے۔ ہر ایک میرے ڈنر میں شرکت کے لئے بیتاب تھا۔ میں بیڈ سے اُترا۔ غصہ میں تلملاتا کار کی چابی اُٹھائی اور باہر آیا۔ سوچا گاندھی چوک سے سب سے اچھی مٹھائی لے آؤں۔

''میں بھی چلتی ہوں'' بیگم بھی ساتھ ہولیں۔ گاندھی چوک ہماری کالونی سے ڈیڑھ کلومیٹر دور تھا۔ کار دھیرے ہی چلانے کا عادی ہوں۔ دور سے گاندھی جی کی قد آدم مورتی کے آس پاس لوگوں کا ہجوم نظر آیا۔ آگے جانے کا راستہ جام تھا۔ سڑک کے ایک طرف کار کھڑی کردی۔ بیگم سے کہہ دیا یہیں بیٹھی رہیں۔ پیدل جاکر سامان لے آؤں گا۔ مجمع کو چیرتا چند قدم آگے بڑھا اور ٹھٹھک کر رک گیا۔ پولس والے خون میں تتر بتر لاش کا معائنہ کررہے تھے۔ صاف نظر نہیں آرہا تھا۔ بغل میں چہ مگوئیاں سنیں۔ بوڑھا بھکاری یہاں سے گزر رہا تھا۔ تبھی چیل نے غوطہ لگایا اور اس کے ہاتھ سے پولی تھین کی تھیلی جھپٹ لی۔ اس نے ہوا میں لاٹھی لہرائی۔ شاید چکرا گیا اور تیز رفتار کار اُسے ٹکر مار کر بھاگ کھڑی ہوئی۔ میں نے پنجوں کے بل کھڑے ہوکر دیکھا۔ واقعی لاش اُس ننگے فقیر کی تھی۔ میری گردن اوپر اُٹھ گئی۔ آسمان چھوتی عمارت کی ایک منزل پر بیٹھ کر چیلیں گوشت کی بوٹیاں پنجے میں دابے نوچ رہی تھیں۔

☆☆☆

چندن پور کا چاند

دُلارے سنگھ راٹھور ایک سال میں بالکل بدل گئے۔ جیسے وہ بیتے ساٹھ سال رہے اب نہ تھے۔ سفید نوکیلی مونچھوں کا کلف، کرخت کلائیاں اور چہرہ کی سُرخی برقرار تھی۔ لیکن زبان کو مٹھاس اور ریشمی بول دینے والی شبنم کافور ہوگئی۔ دوسروں کو سننے کی چاہت اور ہمدردی جتانے کی عادت بھی نہ رہی۔ اُن کے دادا اور پتا شری نے ہمدردی اور دوسروں کے دُکھ درد بانٹنے کی جو وراثت اُنہیں سونپی تھی اُس سے بھی مُنہ موڑ لیا۔ قصبہ کی مسجد سے جس دن لاؤڈ اسپیکر کی کڑک اور گڑگڑاہٹ گونجی اُس کے دوسرے دن شیو مندر سے دوگنی آوازیں آرتی کا شور اُٹھا۔ ہفتہ میں ایک بار کوئی نہ کوئی تیز طرار سادھوی مندر کے وسیع میدان میں پروچن دینے آنے لگی۔ دھرم تو پہلے ہی چندن پور کے گھر گھر میں سانس لیتا تھا مگر اب سڑکوں پر سینہ ٹھونکنے لگا۔

راٹھور حویلی کے آہنی گیٹ کے باہر بڑا سا چبوترہ تعمیر کیا گیا جس پر ٹین کی چادروں کا سایہ تھا۔ اور نیچے گنیش اُتسو، دسہرہ کے تہوار پر بھگوان گنیش اور ماتا درگا کی قد آور مورتیاں آراستہ کی جانے لگیں۔ دُلارے سنگھ کے پرانے دوست کہتے ہیں کہ جب سے وہ دہلی سے لوٹے ہیں اُن کا ہردیہ پریورتن ہوگیا ہے۔ ہفتہ بھر اُس کالونی میں آئے گئے جہاں کشمیری پنڈتوں کو آباد کیا گیا تھا۔ اُن کے رویہ کو دیکھ شمسو حجام کے سفالہ پوش مکان میں رہنے والوں نے دانتوں تلے انگلیاں داب لیں۔ یہ مکان دُلارے سنگھ کے پتا نے اُس دن شمسو کو دیا تھا جب وہ برما سے لوٹا تھا اور ٹین کی پیٹی سے فوجی یونیفارم کے نیچے رکھی ایک چھوٹی سی پوٹلی نکال کر اَمر سنگھ راٹھور کے ہاتھوں میں تھمادی

تھی۔ بڑے ٹھاکر کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے اور انھوں نے شمسو حجام کو سینہ سے لگا لیا۔
اور کہا:

''شمسو۔تُو نے اسمھو کو سمھو کر دکھایا۔

میں اور میری اولاد تیرے اِس احسان کو جیون بھر نہیں بُھلائے گی۔''

سفالہ پوش مکان ایک تنگ گلی میں تھا۔ اتنا لمبا چوڑا کہ چندن پور کے دونوں پرائمری اسکول سما جائیں۔ بڑے آنگن میں پانچ سو آدمی ایک ساتھ پاؤں پھیلا کر بیٹھ جائیں اور اطمینان سے کھانا کھا کر ڈکار لے لیں۔ شمسو کے دونوں بیٹے کوئی کام نہیں کرتے تھے۔ ماں کہتے کہتے مرگئی کہ کام کے نہ کاج کے۔ دشمن اناج کے۔ تیس بکریاں اور پچاس کے قریب دیسی مرغیاں پال رکھی تھیں۔ آرام سے خرچ چل رہا تھا۔ پانچ روپیہ میں ایک انڈا پھکڑ میں گھر بیٹھے بک جاتا۔ بیس انڈے روز ہو جاتے تھے۔ جو مُرغی کڑک ہوتی اُس کے نیچے انڈے رکھ دیتے۔ دو سال میں آٹھ بکرے قربانی کے لئے تیار ہو جاتے اور عید قرباں پر چھ ہزار ایک بکرے کے آسانی سے ہاتھ لگ جاتے۔ رمضان لاولد تھا۔ اس کی بیوی خاتون بی کو شہر کی لیڈی ڈاکٹر نے بانجھ بتا دیا تھا۔ چھ مہینے بھی نہ گزرے تھے کہ رمضان پاس کے گاؤں سے امرت بی کو بیاہ لایا۔ وہ شیخ کلّو جُلاہے کی بیٹی تھی۔ چھوٹے بھائی کرمو کی بیوی مُنّو کا بیٹا چاند بیس سال کا تھا۔

بڑے ٹھاکر اَمر سنگھ کے بخشے ہوئے کچے مکان میں خاتون بی، مُنّو اور امرت بی مل جُل کر بکرا بکری اور مُرغا مُرغی کی نگرانی اور دیکھ بھال کرتیں۔ پچھلے مہینہ راٹھور حویلی کے صفائی کامگار نے رمضان کے کان میں کُھسر پُھسر کی تو رمضان ہکا بکا رہ گیا۔ تینوں عورتوں کے چہرے فق ہو گئے۔ دُلارے سنگھ کو رات کے آخری پڑاو پر مُرغوں کی بانگ بالکل پسند نہیں آتی تھی۔

دہلی سے واپسی کے بعد دُلارے سنگھ راٹھور کے برتاؤ، مزاج اور عادت میں جو بھی انقلاب آیا اُس کا اُن کے معمول پر رتی برابر فرق نہیں پڑا جو پچاس سال سے اُن

کی رگوں میں زندگی کی حرکت بنتے خون کا حصہ بن چکا تھا۔ سویرے سویرے حویلی کی رسوئی کا دروازہ کُھلنے کی آواز سڑک کنارے اِملی کی درخت تلے سوئے ہوئے کالے کتے کو سنائی دیتی تو اُس کے کان کھڑے ہو جاتے۔ چاروں پیروں پر اُس کا جسم تن جاتا۔ سڑک کے بیچوں بیچ جگالی کرتی بھوری جرسی گائے گردن اُٹھا کر حویلی کی طرف دیکھنے لگتی۔ ہر دن کی طرح دُلارے سنگھ پلنگ پر اُٹھ بیٹھتے۔ لمبی انگڑائی لیتے۔ انگلیاں چٹخاتے۔ طاق میں رکھے گلاس میں سے نیم کی دتون نکال کر مُنہ میں دابے ہوئے رسوئی کا دروازہ کھولتے۔ مٹی کی ہانڈی میں سے رات کی چار باسی روٹیاں نکالتے اور بڑا دروازہ کھول کر سڑک پر آ جاتے۔ ہلکے ہلکے اندھیرے میں چڑیوں کی چہچہاہٹ سنتے ہوئے وہ گائے کے قریب آتے۔ اُس کے سر پر آہستہ سے ہاتھ پھیرتے اور تین روٹیاں مُنہ میں سرکا دیتے۔ دو قدم مشکل سے اُٹھاتے کہ اُن کے پاس کتا دوڑا آتا اور دُم ہلانے لگتا۔ مانو سپیرے کی بین پر سانپ پھن پھیلائے ڈول رہا ہو۔ وہ بچی ہوئی روٹی کتے کے آگے ڈال کر اپنے کھیتوں کا رُخ کرتے۔

دُلارے سنگھ نے دہلی کی بستی کا آنکھوں دیکھا حال صرف اپنی پتنی ریکھا دیوی کو سُنایا، ٹھکرائن نے پہلے تو خوب آنسو بہائے پھر اُن کی چتونیں تن گئیں۔ آنکھیں تنور جیسی دہک اُٹھیں۔ کمرہ کی دیوار پر سرخ رنگ کے مخملی خول میں مُغلوں کا خون پیکر اپنی آب و تاب کھو چکی تلواریں جیسے لوہار کے وجود کو کوسنے لگیں۔

''بھاگیہ وان میرا خون کھول اُٹھا تھا۔

گلاب سے لال سرخ گالوں والے معصوم بچے۔ بیر بہوٹی سی سمٹی ہوئی خوبصورت بچیاں''۔

دُلارے سنگھ رُکے اور سامنے فوٹو فریم میں ماں پاربتی کی رنگین تصویر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بات آگے بڑھائی

''بس ایسی ہی سندر کشمیری مہیلائیں، تنگ گلیوں اور گندگی میں چھوٹے چھوٹے

کمروں میں سانس لے رہی تھیں''۔

وہ دیر رات تک ٹھکرائن کو برف سے ڈھکے امرناتھ کا درشن کراتے رہے۔ کیلاش پربت پر نواس کرتے جگ پال شو جی کو پرنام بھی کیے۔ جب سوئے تو سپنے میں اپنے پر دادا فتح سنگھ راٹھور کا زمانہ بھی یاد آیا۔ وہ مونچھوں پر تاؤ دیتے اور کمزور آواز میں کہا کرتے تھے۔ بیٹا۔ ہمارے بیڈروم کی دیوار میں سمائی فولادی تجوری میں کنگ پنجم کی تصویر والے دبیز سو سو کے نوٹ کی گڈیاں، سونے چاندی کے جڑاؤ زیور، چھوٹی بڑی ڈبیوں میں یاقوت، زمرّد، نیلم اور لعل رکھے رہتے تھے۔ لیکن آزادی آئی تو جمہوریت راٹھور خاندان کے لئے سانپ کے نیچے کا بچھو بن گئی۔ مہاراجے اور نواب گئے۔ تعلقداروں اور زمینداروں کا اوڑھنا بچھونا چھن گیا۔ تجوری کی چابی کا وزن اتنا رہ گیا کہ بڑی ٹھکرائن کی چھنگلی انگلی اُسے اُٹھانے سے شرماتی۔ چندن پور ہی کیا، گنگا میا کنارے آباد بستیوں کے کمروں میں جہاں گھوڑے پر سوار مہارانا پرتاپ کی رنگین تصویر ٹنگی رہتی ہیں، وہاں آج بھی چندن پور کے ٹھاکروں کا نام بڑی عزت سے لیا جاتا ہے۔

ڈلارے سنگھ نے دوسرے دن تہیہ کیا کے قصبہ کے بیروزگار اور آوارہ گرد نوجوانوں کی میٹنگ کریں گے۔ اُنھوں نے اخباروں اور میگزین میں رائفل اُٹھائے، وردی پہنے فوجیوں کی تصویریں دکھائیں۔ کئی دن تک یہ سلسلہ چلتا رہا۔ ٹی۔ وی پر ۲۶ر جنوری کی آن بان والی پریڈ کا بھی اِن نوجوانوں نے لگن اور دلچسپی سے نظارہ کیا۔

''فوجی کا بہت سمان ہوتا ہے۔ پگار کی موٹی گڈی ملتی ہے''۔

ڈلارے سنگھ نے کرمو کے بیٹے چاند خاں کی مثال دی۔ جسے خود انہوں نے فوج میں بھرتی کرایا تھا۔

''دیکھتے نہیں کرمو کے کیا ٹھاٹھ ہیں۔ تین کمروں پر پکی چھت ڈال دی اور اپنی پوتی کو اسکول بھیجنے لگا ہے''۔

ڈلارے سنگھ کی محنت رنگ لائی۔ بدری لوہار، نرائن موچی، منوج پنساری

راجو اور ہلکو کا مگار کے جوان بیٹے دُلارے سنگھ کی بھاگ دوڑ تعلقات اور مان سنگھ راٹھور کی قربانی کے سہارے فوجی بن ہی گئے۔

رمضان اور کرمو جمعہ کی نماز پڑھ کے مسجد سے باہر نکلے تھے کہ ہلکو کا مگار اُن کی طرف دوڑتا آیا

''بھائی جی چلو۔ چھوٹے سرکار نے بُلایا ہے''۔

دونوں گھبرائے اور تیز قدموں سے حویلی آئے۔ دُلارے سنگھ باہر چبوترے پر بیٹھے تھے۔ اُن کے ماتھے کا تلک سورج کی روشنی میں چیتے کی آنکھوں جیسا چمک رہا تھا۔ دونوں نے سلام کیا۔ دُلارے سنگھ نے گھورتے ہوئے اپنی بات کہنے میں دیر نہیں لگائی۔

''رمضان۔ ذرا میری بات دھیان سے سُننا۔ میں نہیں سینکڑوں لوگوں نے مجھ سے کہا ہے''۔

رمضان اور کرمو کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ وہ سمجھے کہ مُرغوں کی بانگ پر آج فضیحت ہونی ہے۔ نظروں میں حلال ہوتے تڑپتے اور اُچھلتے مرغے گھوم گئے۔

''چھوٹے سرکار آپ حکم کریں''۔ رمضان بکری کی طرح منمنایا۔ دُلارے سنگھ کے حکم نے دونوں بھائیوں کے ہوش اُڑا دیئے۔ بڑے ٹھاکر یاد آ گئے۔ پَل بھر کو سوچا کہ خصم کیا سنگ سونے کو۔ لگ گئے پتھر ڈھونے کو۔ شِو مندر کے راستے اُن کی بکریوں کا ریوڑ روز جنگل جاتا تھا۔ شِو بھگتوں کو اعتراض تھا کہ ساری کی ساری سڑک مینگنیوں سے گندی ہو جاتی ہے۔ جوتے چپل کی بات دور رہی کہ ننگے پاؤں جانے والے مندر کی سیڑھیوں پر بھی مینگنیاں سمیٹ لے جاتے ہیں۔ اس لئے کل سے بکریاں اُس سڑک سے جنگل جائیں جو مسجد کے پچھواڑے ہے۔ رمضان جانتا تھا کہ پچھواڑے والی سڑک سے جنگل پانچ کلومیٹر دور ہے۔ وہ ایک سال پہلے ہی سب کچھ سمجھ گیا تھا جب دُلارے سنگھ دہلی سے آئے تھے اور شِو مندر میں لاؤڈ اسپیکر لگا تھا۔ دونوں سر جھکائے واپس لوٹے اور گھر کے بجائے بڑے ٹھاکر مان سنگھ راٹھور کی سمادھی کی طرف مُڑ گئے۔ شمو حجام کے

بیٹے رمضان اور کرمو سمادھی کے سامنے یوں کھڑے تھے جیسے چاند خاں کشمیر کی سرحد پر چوکسی سے پہرہ دے رہا ہو۔

مان سنگھ راٹھور جب حجامت بنواتے تو گاندھی جی اور دیش کی آزادی کی باتیں کیا کرتے۔ اُنہیں فرنگیوں سے بڑی نفرت تھی۔ اپنے کمرے میں مہارانا پرتاپ کے بغل میں نیتاجی سبھاش چندر بوس کی تصویر بھی ٹانگ رکھی تھی۔ شمو حجام بڑی دلچسپی سے سب کچھ سنتا۔ بال کاٹنے اور شیونگ کے بعد قینچی، اُسترا، مشین، برش اور صابون کی ڈبیا اپنی پیٹی میں رکھتا اور فرش پر بیٹھ جاتا۔ کچھ ہفتے گزرے ہونگے۔ بڑے ٹھاکر اور شمو حجام میرٹھ گئے اور آزاد ہند فوج میں بھرتی ہو گئے۔ مہینہ بھر بعد مان سنگھ راٹھور برما روانہ ہوئے تو شمو حجام بھی ٹین کی چھوٹی پیٹی لئے اُن کے ساتھ تھا۔ اُسے آزادی کی متوالوں کی حجامت کے کام پر مامور کیا گیا تھا۔ چندن پور کے نمازیوں اور بھگتوں کے سر فخر سے اونچے ہو گئے۔ ہُوا یوں کہ ایک دن اتحادی ہوائی جہازوں نے رنگون اور آس پاس کے جنگلوں پر زبردست بمباری کی۔ لاتعداد جاپانی سپاہی ہلاک ہوئے۔ آزاد ہند فوج کے مان سنگھ راٹھور اور تین سپاہی بھی شہید ہو گئے۔ اِن چاروں کی چتائیں جلیں۔ دلدلی جنگل میں سوکھی لکڑیاں مشکل سے ملتی تھیں۔ تین دن تک چتاؤں سے شعلے اور دھواں اُٹھتا رہا۔ شمو حجام دن رات جنگلوں کے چکر کاٹتا اور لکڑیاں ڈھوتا رہا۔ تب کہیں لاشیں راکھ ہوئیں۔ شمو حجام نے اپنی زندگی میں لے دے کر ایک عقلمندی کا کام کیا۔ سر سے رومال کھولا اور مان سنگھ راٹھور کی چتا سے راکھ اور دو چار چھوٹی ہڈیاں باندھ لیں۔ جنگ ختم ہوئی اور وہ چندن پور زندہ سلامت واپس آ گیا۔ مان سنگھ راٹھور کے شہید ہونے کی خبر راٹھور حویلی میں پہلے ہی آ چکی تھی۔

دونوں بھائیوں نے طے کیا کہ چندن پور کے ایسے ہولناک ماحول میں زندگی کو اُس دوراہے تک لے جانا ہوگا جہاں سے ڈھلان اور چڑھائی صاف نظر آئے۔ وہ ایک فیصلہ کر چکے تھے۔ سمادھی سے اُنہیں اب کوئی امید نہ تھی۔

''بڑے ٹھاکر۔ یہ کیا ہو رہا ہے۔ کچھ تو کریں آپ''۔ سمادھی پر نظریں گاڑے رمضان بُد بُدایا۔ دونوں پندرہ منٹ وہاں رُکے اور گھر لوٹ آئے۔ منہ لٹکا ہوا تھا۔ مسجد سے دیر سے لوٹے تھے۔ اُنھوں نے گھر کا نظام بدلنے کا فیصلہ سُنایا۔ اور اپنے اپنے کمرہ میں چلے گئے۔ خاتون بی اور امرت بی رمضان کے پاؤں دبانے لگیں۔ مُنّو نے کرمو سے بہت پوچھا کہ بھائی صاحب بھی آج اُداس ہیں۔ تمہارا چہرہ بھی سُت گیا ہے۔ تبھی سڑک کے پار نرائن کے گھر سے رونے، چیخنے کی آوازیں آئیں، رمضان اور کرمو گھبرا کے اُدھر کو لپکے۔ قصبہ کے ان گنت لوگ وہاں جمع تھے۔ دُلارے سنگھ بھی آگئے۔ نرائن کے بیوی بچوں کے آنسو تھم نہیں رہے تھے۔ کرمو کو ماجرا معلوم ہوا تو اُس نے دونوں ہاتھ چھاتی پر رکھ لئے۔ نرائن کا بیٹا مہیش کارگل کی لڑائی میں مارا گیا اور اُس کی لاش کل جہاز سے قریب کے ہوائی اڈّہ پر آئے گی۔

چاند خاں نے اس ماہ تنخواہ میں سے آٹھ ہزار روپے بھجوائے تو اُسی دن کرمو نے بیس مرغیاں اور پانچ مُرغے ہاٹ بازار میں بیچ دیئے۔ رمضان نے کرمو کے مشورہ پر بانجھ خاتون بی کی ڈیوٹی لگادی کہ سویرے بانگ دینے سے پہلے ڈربے کے اوپر ڈنڈا بجاتی رہے تاکہ مُرغے ڈر کے مارے چُوں بھی نہ کرسکیں۔ کمزور اور کم دودھ والی بکریوں کی چھٹنی بھی دھیرے دھیرے ہوتی رہی۔ اِن کے دودھ سے وہ ماوہ تیار کرتے تھے جو مہیپال حلوائی اچھے بھاؤ میں خرید لیتا۔ بکری کے ماوہ کی گلاب جامن انتہائی لذیذ ہوتی اور گھنٹہ بھر میں پورا کڑاہو خالی ہو جاتا تھا۔ دُلارے سنگھ کی بے رُخی اُن کے چہرے سے دُلارپن کی مٹتی لکیریں سفالہ پوش مکان کے در و دیوار اور آنگن کی خوشیوں پر بجلی بن کر گرنے لگیں۔ بکریاں کم ہوئیں تو ماوہ کے برتن بھی کھڑکنے لگے۔ آمدنی کا بڑا ذریعہ رمضان کے ہاتھوں سے کھسک رہا تھا۔ خاتون بی اور امرت بی کی آنکھوں کا کاجل آنسوؤں نے دھو دیا۔ کرمو کے بیٹے چاند خاں سے روپیہ کا سہارا نہ ہوتا تو رمضان اپنے والد شمّو حجام کی پیٹی اُٹھا کر سڑک کنارے حجامت کا پیشہ کرنے کا پکا ارادہ

کر چکا تھا۔

ڈلارے سنگھ نے المونیم کے تابوت اُٹھائے چار فوجیوں کو دیکھا تو ہزاروں افراد کے بیچ سربراہی کر رہے کیپٹن سے کڑوے لہجے میں کہا:

''آپ کو دھارمک رکریا کا اپمان کرتے شرم نہیں آتی؟ ارتھی کیوں نہیں لائے؟

یہ کرستان کے تابوت میں شہید کی لاش آئی ہے''۔

ہفتہ بھر بعد بدری لوہار کا بیٹا بھی ایمونیم کے تابوت میں آیا۔ ڈلارے سنگھ جل بھن گئے۔ چلا چلا کے ناراضی جتاتے رہے۔ کالے کے آگے چراغ نہیں جلتا۔ فوجی بہر حال اعلیٰ تھے اور برما کے جنگل میں راکھ ہوئے نیتاجی کے فوجی کی وراثت ہلکی پڑنی ہی تھی۔ ڈلارے سنگھ کا اعتراض ٹال دیا گیا۔ لیکن دوبار اُن کی ہدایت پر چندن پور میں سختی سے عمل ہوا۔ مسجد نے بھی سوگ منایا اور لاؤڈ اسپیکر پر اذان نہیں دی گئی۔ رمضان اور کرمو کو وہ دن بھی یاد آیا جب بابری مسجد مسمار ہونے پر سارے دیش میں دنگے ہوئے۔ ڈلارے سنگھ نے چندن پور میں دن رات گشت لگایا اور امن شانتی کی اپیل کرتے رہے تھے۔

رمضان کا مہینہ شروع ہونے میں پندرہ دن باقی تھے کہ ایک دوپہر کلکٹر کا اردلی اسپیڈ سے موٹر سائیکل بھگاتا آیا اور گلی کنارے موٹر سائیکل کھڑی کر کے تیزی سے رمضان کے مکان پر پہونچا اور زنجیر کھٹکھٹائی۔ رمضان کھانا کھا رہا تھا۔ نوالہ چباتے ہوئے باہر آیا۔ اردلی نے سیل بند لفافہ اُس کی طرف بڑھایا۔ رمضان مسکرادیا۔

''کہاں سے آیا ہے۔ بھیا کھول کے پڑھ بھی دو''۔

''ملٹری ہیڈ کوارٹر سے'' اردلی نے لفافہ کھولا۔ لرزتی آواز میں آہستہ سے پڑھ دیا۔ رمضان غش کھا کر گرنے کو تھا کہ اردلی نے بازو پھیلا کے اُسے سنبھالا۔ خاتون بی دوپٹہ پھینک بے پردگی کی پرواہ کئے بغیر بھاگتی آئی۔ خبر ہی ایسی ڈراونی تھی۔ چاند خاں

کارگل کی پہاڑیوں میں دشمن کی گولہ باری میں شہید ہوگیا۔ دو دن بعد اُس کی لاش ہوائی جہاز سے چندن پور پہنچ گی۔ اردلی عورتوں کی چیخوں سے حواس باختہ گلی میں دوڑتا موٹر سائیکل کے پاس آیا اور اُسے اسٹارٹ کر آفس کی طرف چل دیا۔ رونے پیٹنے کی آوازیں گھر گھر گونجیں۔ دوسرے محلّوں تک گئیں۔ کرمو۔ منّتو اور رمضان بے ہوش تھے۔ دروازہ کُھلا ہوا تھا۔ بکریوں اور مُرغا مُرغیوں کو آزادی نصیب ہوئی اور کودتی اُڑتی گلی سے سڑک پر آ گئیں۔ چندن پور میں ماتم چھا گیا۔ لوگ جوق در جوق شمسو حجام کے محلّہ میں آنے لگے۔ کرمو کو ہوش آیا تو وہ بڑے بھائی اور منّتو کو نمناک آنکھوں سے فرش پر خاموش پڑا دیکھتا رہا۔ بیٹی نے بلکتے ہوئے خبر دی کہ باہر شہر والوں کی بھیڑ ہے۔ وہ کمزور چال سے گلی میں آیا۔ سامنے دُلارے سنگھ راٹھور کھڑے تھے۔ اُن سے آنکھیں چار ہوئیں تو روتا ہوا پاؤں چھونے جُھکا ہی تھا کہ دُلارے سنگھ نے بازو پکڑ لئے اور اُسے چھاتی سے لپٹا لیا۔

''روتے نہیں کرمو۔ تیرا بیٹا چاند دیش کے لئے شہید ہوا ہے۔ بالکل مت گھبرانا۔ ابھی میں زندہ ہوں''۔

جمعہ کے دن گیارہ بجے ویسا ہی نظارہ تھا جب نرائن اور بدری کے بیٹوں کے تابوت چندن پور کے شمشان گھاٹ لائے گئے تھے۔ فرق یہ تھا کہ چاند خاں کا لکڑی کا تابوت قبرستان آیا۔ شیشے کی چوکھٹ میں سے پورے شہر نے اُس کا چہرہ دیکھا۔ برقع پہنے اس کی ماں، دونوں بڑی مائیں، اور چھوٹی بہن لڑکھڑاتی آبشار برساتی آنکھوں سے چاند خاں کے پُرسکون چہرے کو دیکھ رہی تھیں۔ جنازہ کی نماز کے لئے لاری سے تابوت فوجیوں نے اُتارا اور کھلے میدان کی طرف چلنے کو تھے کہ رمضان، کرمو اور دُلارے سنگھ کے ساتھ ایک سپاہی نے کاندھے پر اُٹھا لیا۔ لوگ آتے گئے اور کاندھا دیتے رہے۔

رمضان کا چاند نظر آ گیا۔ سفالہ پوش مکان میں غمزدہ ماحول ضرور تھا لیکن

رمضان جیسے مقدس مہینہ کا پورا احترام ہوا۔ روزے، تراویح، سحری اور افطار خاموشی سے جاری رہا۔ چاند خاں کی مغفرت کے لئے قرآن شریف کے کئی ختم ہوئے۔ عید کے لئے سویاں بنائی گئیں۔ برسوں سے شمسو حجام کے گھر سے شیر خرما اور دہی بڑے کے ڈونگے تھال میں رکھ کر راٹھور حویلی میں جاتے تھے۔ پہلے رمضان اور کرمو تھال لے جایا کرتے تھے۔ شمسو کی رحلت کے بعد کرمو اور چاند خاں اسے فرض کی طرح انجام دینے لگے۔ عید کے دن گلی کے باہر سڑک کی فٹ پاتھ پر کرسیاں رکھ دی جاتی تھیں۔ اپنی زندگی میں مان سنگھ راٹھور، اُن کے بیٹے امر سنگھ اور پوتے دُلارے سنگھ وہاں عید ملنے اور مبارکباد دینے آتے تھے۔ دو میٹھی عید پہلے تک دُلارے سنگھ ضرور آئے۔ اُس کے بعد گھٹنوں کے درد کا کہلا دیا۔ شیر خرمے کی تھال بھی لوٹتی رہی کہ ٹھاکر اور ٹھرائن شُگر کے مریض ہیں۔ میٹھا نہیں کھا سکتے۔ دہلی کی کشمیری پنڈت بستی نے راجپوتی آن بان والے خون کو اِتنا ہی گرما دیا تھا۔ اب کی عید پر رمضان اور کرمو کو پوری امید تھی کہ چاند خاں کی شہادت اُن کے گھٹنوں کے درد پر ضرور مرہم رکھے گی۔ مگر دُلارے سنگھ نہیں آئے۔ رمضان اور کرمو نے اُن کے ہردیہ پریورتن پر یقین کرلیا۔ چاند خاں نے کشمیری پنڈتوں کی واپسی کے لئے جنگ نہیں لڑی تھی۔ مُنّو کی ممتا سب سے زیادہ دُکھی تھی کہ اُس کے لاڈلے نے برما کے جنگلوں سے زیادہ خطرناک جنگ میں اپنی جان قربان کی۔ وہ جنگ آزادی حاصل کرنے کے لئے تھی اور چاند نے آزادی کی حفاظت کے لئے سینہ پر گولیاں کھائیں۔ مُنّو عید کی پہلی رات پل بھر کو سوئی نہیں۔ صبح ہونے سے پہلے اُس نے کھونٹی سے برقع اُتارا۔ گھر میں سب تھکے ماندے گہری نیند سوئے ہوئے تھے۔ مُرغے اونچی آواز میں بانگ دے رہے تھے۔

دُلارے سنگھ ہمیشہ کی طرح جاگ گئے۔ جمائی لیتے ہوئے مُنہ میں دتون دبائی، رسوئی میں سے چار روٹیاں نکالیں اور بیرونی دروازہ کھول سڑک پر آگئے۔ اچھا خاصا اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ جانی پہچانی جگہ گائے کی طرف آئے اور تین

روٹیاں اُس کے منہ میں ڈالنے کی کوشش کی۔ اچانک جیسے اُن کے ہاتھ میں کرنٹ سا لگ گیا۔ آنکھیں پھاڑ کے دیکھا اور روٹیاں پھسل کر زمین پر گر گئیں۔ اُس وقت اِملی کے درخت کے نیچے سے کتا بھی ہر روز کی طرح دوڑتا نہیں آیا۔ دُلارے سنگھ خوف اور حیرت سے چیخ اُٹھے۔

''تُو تُو منتو!۔

نقاب میں سے مُنتو روہانسے لہجہ میں بولی۔

''عید مبارک ٹھاکر صاحب''! وہ اُٹھی اور اندھیرے میں گُم ہوگئی۔

☆☆☆

ماؤس

دہلی سے آنے والی پنجاب میل ایک گھنٹہ لیٹ چل رہی تھی۔ میں اپنی بیٹی کرونا کے ساتھ آدھے گھنٹہ سے بیٹھا ہوا بڑے غور سے دوسرے پلیٹ فارم تک بچھی فولادی پٹریوں کو دیکھ رہا تھا۔ اسٹیشن پر کہرہ تو نہیں تھا لیکن دہلی سے گوالیار تک کڑاکے کی ٹھنڈ نے ریلوے انجنوں کو گھٹنوں کے بل چلنے پر مجبور کردیا ہوگا۔ ادھر سے آنے والی ہر ٹرین کئی کئی گھنٹے دیر سے آرہی تھی۔ بمبئی اور حیدر آباد کے مسافروں کا ہجوم تھا۔ اونی ٹوپی گلے میں مفلر، سوئٹرس، رنگ برنگی شالیں اور گرم کوٹ میں کانپتا، سکڑتا ہر چھوٹا بڑا ٹرین کی گڑگڑاہٹ سننے کو بیتاب تھا۔ ایسے بھی بہت تھے جو میلی پھٹی چادروں اور جوٹ کے پرانے تھیلوں سے جسم ڈھانپے فرش پر بیٹھے تھے۔ مرد، عورتیں اور بچے مزدور طبقہ کے تھے۔ ٹھیکیدار کے مقدم ایڈوانس ہفتہ دیکر انہیں ایک شہر سے دوسرے شہر لے جاتے ہیں۔ کیسا بھی موسم ہوان کے کھوٹے مقدر کو نابینا کی طرح ٹاکتا گزر جاتا ہے۔ میری آنکھیں پٹریوں پر گڑی ہوئی تھیں۔ کرونا اکتا کر پوچھ بیٹھی۔

''پاپا۔ وہاں کیا دیکھ رہے ہو''

مجھے ہنسی آگئی۔ پانی کی خالی پچکی ہوئی بوتلیں، کھانے کے ڈبے جن میں بچا ہوا چاول، روٹی پاپڑ کے ٹکڑے اور نہ جانے کیا کیا الا بلائیں دور دور تک لکڑی کے سلیپرس کے بیچ پڑی تھیں۔ میں نے کرونا کو اشارہ کیا۔

''دیکھو بیٹی۔ کتنے ڈھیر سارے چوہے پلیٹ فارم کی دیوار سے اُبلے پڑ رہے ہیں۔''

کرونا کا جیسے جی متلا گیا۔ اس نے کراہیت سے ہونٹ سکوڑے۔ ہر سائز کے

چوہے تھے۔ چھوٹے، بڑے اور موٹے۔ بے خوف اور بڑے اطمینان سے اگلے پنجوں میں کچھ نہ کچھ دابے کترتے اور پھر بلوں میں گھس جاتے۔ مجھے حیرت ہوئی کہ اتنی بڑی تعداد میں پیٹ بھرنے کی جھپٹا ہٹ کے باوجود وہ ایک دوسرے سے نہ تو جھگڑ رہے تھے اور نہ ہی کسی طرح کی آپا دھاپی تھی۔ ہمارے اسٹیشن سے چوبیس گھنٹے میں سینکڑوں مسافر ٹرین آتی جاتی ہیں۔ کھانے پینے کا بے شمار سامان مسافر پھینک جاتے ہیں جو سالہا سال سے نسل در نسل ان چوہوں کی پرورش کرتا آیا ہے۔ میں نے کرونا کو بتایا کہ چاند سیاروں تک پہنچنے والے انسان نے ایک دوسرے کو مارنے کے لئے مہلک ایٹمی ہتھیار تو بنا لئے ہیں۔ لیکن ایسے اسلحہ نہیں ایجاد کر پائے جو اربوں کھربوں ٹن اناج کھا جانے والے چوہوں کو نیست و نابود کر سکے۔

''ہاں پاپا'' کرونا بولی ''کل ہی اخبار میں پڑھا کہ بھارت کو چین سے اتنا خطرہ نہیں جتنا چوہوں سے ہے۔ یہ سرحد پر فوج کے راشن کو بے پناہ نقصان پہونچاتے ہیں۔''

میری نظریں غول در غول آتے جاتے، کھاتے اور بلبلاتے چوہوں سے ہٹ نہیں رہی تھیں۔ ساتھ ہی کرونا سے باتیں بھی کرتا جا رہا تھا کہ صحرائی جانوروں کی گنتی کی جاتی ہے۔ مردم شماری ہوتی ہے لیکن چوہوں کی آبادی معلوم کرنا ایسا ہی ناممکن ہے جتنا ستاروں کی گنتی کرنا۔ لاکھ بلیاں پالیں، چوہے مار دوائیں استعمال کریں، چوہے دان لگائیں۔ لاکھوں اربوں مار ڈالے بے گنتی بے حساب، سانپوں نے کھائے مگر ان کا وجود ختم نہیں ہوا۔

ہمارے کئی علاقوں کے آدیباسی بڑے شوق سے چوہے کھانے کے عادی ہیں۔ جنگلی چوہوں کا شکار کرتے ہیں شاید اسی وجہ سے جنگلی علاقے کے چوہے جان بچا کر شہروں کی طرف بھاگتے ہیں۔

ایک چوہیا تین مہینے میں چھ ساتھ بچے جنم دیتی ہے۔ اُدھر سائنسداں نت نئے

امراض کی دوائیں ایجاد کرتے ہیں اور چوہوں پر کامیاب تجربہ کر کے انسان کو تندرستی کی ضمانت دیتے ہیں۔

کرونا کا انڈین آئل کارپوریشن کے ممبئی آفس میں سیلز آفیسر کی پوسٹ کے لئے انٹرویو تھا۔ وہ تحریری ٹیسٹ پاس کر چکی تھی اور ایم بی اے میں ٹاپ کیا تھا۔ مجھ سے زیادہ وہ فکرمند تھی کہ دس پوسٹ کے لئے لاکھ سے اوپر امیدوار تھے۔ لیکن تحریری ٹیسٹ میں پاس ہو جانے سے اسے امید تھی کہ انٹرویو میں ضرور بازی مار لیگی۔ میرا دل البتہ مطمئن نہیں تھا۔

سوچتا رہتا ہوں کہ چوہوں کی طرح بیروزگار نوجوان دن بدن بڑھتے جا رہے ہیں۔ ماں باپ انہیں پال پوس اور پڑھا لکھ کر تمنا کرتے ہیں کہ بڑھاپے کا سہارا بنیں گے۔ مگر روزگار کی تلاش میں ان کے کاندھے بھی جھک جاتے ہیں۔ چوہوں کا نصیب ہی اچھا۔ نہ کھانے کی فکر اور نہ سر چھپانے کا مسئلہ۔ پنجاب میل کے آنے کا اعلان ہو چکا تھا۔ مسافروں میں کھلبلی مچ گئی۔ زوردار گڑگڑاہٹ سُن چوہے بھی اُچک اُچک بلوں میں گھس گئے۔ میں نے ان کی ہوشمندی کو بھرپور چاہت سے دیکھا۔ بریف کیس اور ہولڈال اٹھایا اور کرونا کے ساتھ سلیپر کی ''ڈی'' بوگی میں چڑھ گیا۔ اپنی سیٹ نمبر کی تصدیق کے بعد ہم دونوں اطمینان سے بیٹھ گئے۔ دماغ ابھی بھی مستی کرتے چوہوں میں الجھا ہوا تھا۔

ٹرین چلی تو کچھ پل آنکھیں بند کر کے میں نے دل ہی دل میں ایشور سے پرارتھنا کی کہ بیٹی کو نوکری مل جائے۔ جب اس کی ماں شانت ہوئی وہ پندرہ سال کی تھی۔ آج ۲۲ سال کی عمر میں پہلی بار سفر کو نکلی تھی۔ ایک نئی منزل کی تلاش۔ کمپیوٹر آپریٹر کی پوسٹ پر میں نے بیس سال گذار دیئے تھے۔ دو کمروں کے سرکاری فلیٹ سے کرونا کی ماں کی ارتھی اٹھنے کے دو ماہ بیتنے کے بعد ہی سے ساس سسر نے دوسری شادی کے لیے کا بار بار زور دیا۔ مگر میں نے انکار کر دیا تھا اور دل میں ٹھان لیا کہ کرونا کو اعلیٰ سے

اعلیٰ تعلیم دلواؤں گا۔کھیت جوتنے اور فصل کاٹنے تک کسان جس طرح کڑی محنت اور پسینہ بہاتا ہے۔ ویسی ہی محنت میں کرونا کی تعلیم پر کرتا آیا۔ کرونا بھی اپنی ماں کی اچھاؤں کو پوری کرنے کی پرتکیا کر چکی تھی۔ روز دس سے ۱۵، گھنٹے پڑھتی۔ میں جب اسکول میں تھا تو کورس کی کتابیں دو سے چار روپئے میں اور کاپی ڈیڑھ روپئے میں مل جاتی تھی۔ آج کرونا کی کوئی کتاب سوا سو روپئے سے کم کی نہیں۔

میں نے کرونا کو کبھی احساس نہیں ہونے دیا کہ گھر کا خرچ اور اس کی تعلیم کا بوجھ کتنے جتن سے اٹھا رہا تھا۔ تہوار ایڈوانس اور غلہ ایڈوانس دفتر سے لیتا اور کرونا کے لئے کتابیں اور کپڑے خرید لاتا۔ کچھ مہنگی کتابوں کی فہرست وہ مجھے نہیں دیتی۔ لائبریری سے لاکر نوٹس تیار کر لیتی۔ اپنی سہیلیوں سے مانگ لاتی۔ وہ رات دیر تک پڑھتی رہتی اور صبح میں ناشتہ بناتا اور لنچ بھی تیار کر لیتا جب وہ اٹھتی تو مجھ سے لڑنے لگتی۔

''پاپا آپ یہ سب کیوں کرتے ہیں۔ میں بار بار منع کرتی ہوں۔ مگر آپ نہیں مانتے''

اس کی آنکھیں چھلک پڑتیں اور وہ میری چھاتی سے آلگتی۔ میں اس کے سر پر ہاتھ پھیرتا، پیشانی کو چومتا اور سمجھاتا کہ باپ اگر ماں کی ممتا کا نباہ کرے تو اس کے پاپ دھل جاتے ہیں۔ ہم دونوں کے پاس ایک ہی مقصد تھا۔ وہ اعلی تعلیم سے اپنے کو آراستہ کرنے کی آرزومند اور میں دن رات اسے جیون کی ایسی بلندی پر پہونچانے کی کوشش میں گھن چکر بنا رہتا جہاں دکھوں، پریشانیوں اور آنسوؤں کے خونی ہاتھ نہ پہونچ سکیں۔

پنجاب میل دو گھنٹے لیٹ چل رہی تھی۔ ۷ بجے صبح اگت پوری پر ہالٹ کیا۔ اِدھر اور اُدھر مٹی اور بڑے پتھروں کے ٹیلے تھے۔ ان پر جھونپڑپٹیاں ٹڈی دل جیسے ہل ڈول رہی تھیں۔ پھٹی پرانی ساڑھیاں پہنے جوانی اور بڑھاپا پلاسٹک اور زنگ آلود ٹین کے اندھیارے میں غربت کی ٹکسال پر نہ جانے کتنی نسلیں ڈھال چکا ہوگا۔ کرونا ٹائلٹ

گئی ہوئی تھی اور میری آنکھیں ٹیلے کے چھوٹے چھوٹے بدنما تاج محلوں سے پھسلتی لوہے کی پٹریوں پر گڑ گئیں۔ وہی بھوپال اسٹیشن جیسا نظارہ تھا۔ کالے مٹیالے چوہے جنگ میں ہارے فوجیوں کی طرح بھاگ دوڑ رہے تھے۔ صبح سویرے مسافروں کا ہجوم گرم گرم پکوڑے، پراٹھے آملیٹ، بھیل پوری اور نہ جانے کیا کیا کھانے ٹوٹ پڑا تھا۔ نیچے اور اوپر Twotier سسٹم سے بھوک پر حملہ ہوا تھا۔ میں حیرت میں ڈوبا ہوا تھا کہ سات سو کلومیٹر دور سے اگت پوری تک چوہوں کی حکمت عملی کسی فوجی نقل و حرکت سے کم نہ تھی۔ بیچ بیچ میں جہاں مسافر گاڑیاں نہیں رکتیں وہاں ان کی چوکیاں قائم ہونگی جو مال گاڑیوں میں لدے اناج پر ہاتھ صاف کرتی رہتی ہیں۔ کہتے ہیں ہمارا ریلوے نظام دنیا میں پہلے نمبر پر ہے۔ ادھر ایسا کوئی کمپیوٹر نہیں، کوئی Mathmetician نہیں جو چوہوں کی صحیح تعداد بتا سکے۔

یکا یک چوہوں کے ان گنت بچے بھی بلوں سے باہر آ نکلے۔ وہ تیزی سے ایک دوسرے کے اوپر کودتے ڈھلواں دیواروں پر چڑھتے اور جھونپڑیوں میں گم ہوتے گئے۔ انہیں اپنے مستقبل کو سنوارنے کا یہی موقع اور یہی طریقہ ہے کہ روٹی کترنے اور ڈھونڈنے کے لئے آگے بڑھیں۔

کرونا آئی تو مجھے دیکھ کر ہنس پڑی۔

''واہ پاپا۔ آپ ان چوہوں کا پیچھا نہیں چھوڑینگے۔ یہ بھگوان گنیش کی سواری ہیں''

''ٹھیک کہتی ہے بٹی''۔

''پر تم ان کے آگے ہاتھ جوڑ کر نوکری مل جانے کی پرارتھنا کرو ممبئی پہنچنے میں ابھی تین ساڑھے تین گھنٹے ہیں۔ یہی کرتی رہو''

کرونا ہنستے ہوئے سیٹ پر بیٹھ گئی۔ مگر ٹرین چلنے تک سمجھاتی رہی کہ بھگوان پر

بھروسہ کریں۔ ہمارے اچھے دن آنے والے ہیں۔ وہ شیخ چلی جیسے سپنے دکھانے لگی۔ ایک نوکرانی جھاڑو برتن اور کھانا بنائے گی۔ دوسری کپڑے دھونے اور بازار سے سودا لانے کے لئے رکھے گی۔ دیکھ لینا پاپا۔ میں آپ کی محنت کا پل پل لوٹاؤں گی۔ اس کے آنسو نکل آئے۔

''اور بیٹا تیری شادی بھی کرنی ہوگی''

''کبھی نہیں۔ میں شادی نہیں کروں گی'' ٹرین کھسکنے لگی اور میں نے چوہوں کو آخری بار جان کی حفاظت کے لئے اپنے اپنے بنکروں میں واپس لوٹتے دیکھا اور آنکھیں بند کرلیں۔ چوہوں کو دماغ سے نکال پھینک ایک بار پھر کرونا کے آنے والے دنوں کے بارے میں سوچنے لگا۔ خوبصورت پیازی رنگ کی چندیری سلک ساڑی پہنے، اونچی ہیل کا سینڈل، بالوں میں جوڑا اور سیاہ پرس ہاتھ میں لئے وہ افسرانہ انداز میں اپنے فلیٹ سے اتری اور نیچے کچھ گز دور بس اسٹاپ پر پہونچی۔ باندرہ دفتر کو جانے کے لئے اسے ایک گھنٹہ پہلے گھر سے نکلنا ہوتا ہے۔ جس دن کرونا کو اپائنمنٹ لیٹر ملا، میں نے اس دن رٹائرمنٹ کے لئے درخواست دیدی۔ گھر کا تمام سامان پڑوسیوں اور کباڑی کو فروخت کیا اور فلیٹ کا قبضہ اسٹیٹ آفس کو سپرد کردیا۔ ممبئی میں فلیٹ ملنا کسی دفینہ کے پالینے جیسے معاملہ ہے۔ ہفتہ بھر ایک سستے ہوٹل میں رکنا ہوا۔ بڑی مشکل سے ایک کمرہ کا فلیٹ حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ کرونا کو تنخواہ کا پہلا چیک ملا تو میری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ ۷۵ ہزار روپے۔ ایشور قسم میرے آفس میں پانچ بابو اور دو چپراسیوں کو ہر ماہ تنخواہ بانٹنے کے لئے بڑے بابو بینک سے ستر ہزار روپے لایا کرتے تھے۔ مجھے آٹھ ہزار ملتے تھے۔ مجھے سکتہ میں دیکھ کرونا مجھ سے لپٹ گئی۔ چیک میری جیب میں ڈال دیا۔ تین مہینے بعد کرونا نے دو کمرہ کا فلیٹ اٹھالیا۔ اسے مکان بھتہ بھی کارپوریشن دیتی تھی۔ میرے لئے ریڈی میڈ پانچ شرٹ پینٹ خریدے۔ جھاڑو برتن اور کپڑے دھونے والی نوکرانیاں بھی آگئیں۔ مجھے وشواس ہوگیا کہ کرونا کو وہ منزل مل

ہی گئی جہاں دکھ تکلیف کی رسائی نہیں۔

''پاپا اٹھئے۔ چھترپتی شیواجی ٹرمنس آ گیا''

میں خوش فہمیوں کی بھول بھلیوں سے چونک کر اٹھ کھڑا ہوا۔

''ہمیں تو ممبئی اترنا ہے''

''یہی ممبئی ہے'' کرونا نے چھوٹے دو بریف کیس اٹھا لئے۔ چلتے چلتے میں نے کھڑکی سے باہر دوسری طرف کے پلیٹ فارم کے نیچے جھانکا اور سر سے پیر تک جھرجھری آ گئی۔ چوہے دَل بَل کے ساتھ یہاں بھی اُبلے پڑ رہے تھے۔ میرے منہ سے نکلا

''گنپتی بپا موریا''

ہوٹل تلاش کرنے کا سوال نہیں تھا۔ کرونا ٹرین میں تیار ہوگئی تھی۔ دن کے بارہ، بجے باندرہ (ایسٹ) میں انڈین آئل کارپوریشن کے آفس میں کرونا کی آمد درج کرانی ہوگی کیونکہ ایک بجے سے انٹرویو شروع ہونا تھا۔ دیش کے عالیشان اسٹیشن سے باہر آ کر ہم دونوں دیہات سے آئے گنواروں کی طرح ہر طرف اونچی عمارتوں، ہزاروں گاڑیوں اور انسانوں کو ادھر سے اُدھر آتا جاتا دیکھتے رہے۔ پندرہ منٹ میں اپنی حیرت پر قابو پایا۔ چہرے سے پسینہ پونچھا تب ٹیکسی روکنے کے لئے ہاتھ اٹھایا۔ ڈرائیور کو پتہ بتایا اور ٹیکسی چل پڑی۔ میں نے آہستہ سے کہا۔

''بیٹی ذرا سوچ تو بھلا ہے نا چوہوں جیسی دھما چوکڑی۔ کشمیر سے کنیا کماری تک ایک ہی اسٹائل کی آشا اور نراشا کی بھگدڑ''

ممبئی کے رنگارنگ نظاروں اور اگت پوری سے یہاں تک ٹرین میں دیکھے سپنوں نے میری دماغ کو ایک بار پھر بیدار کیا۔ کار اور بسوں کے ہارن سے کان کے پردے ہلنے لگے۔ کرونا جنرل نالج کی موٹی کتاب کے ورق الٹ رہی تھی۔ میں بولنے پراتارو تھا۔ بولتا رہا کہ بھگوان کرشن نے ارجن سے کہا تھا جو پیدا ہوتا ہے اسے مرتیو بھی آتی ہے۔ پرنتو مرے ہوئے کا پُنر جنم ہوتا ہے۔ اس لیے بنا چنتا کیے جنگ کر۔

''بیٹی ۔ اپنی نالج میں جوڑ لے کہ مہابھارت کی جنگ میں
چھیاسٹھ لاکھ سے اوپر کورو ہلاک ہوئے تھے ۔ میرا وشواس
ہے کہ اربوں مرنے والے انسان ان چوہوں کی شکل میں جنم
لیتے ہیں''

''پاپا۔ ایشور کے لئے بور نہ کریں'' کرونا پیار سے اٹھلائی اور جھنجھلائی ۔
انڈین آئل کا کئی منزلہ دفتر دیکھ کر میں کچھ نروس ہوا۔ لیکن کرونا بھروسہ سے رسپشن
کاؤنٹر پر گئی اور پتہ لگالائی کہ تیسرے منزل پر چلی جائیں ۔ لفٹ سے وہاں گئے تو ایک
بڑے ہال میں صوفے اور کرسیوں پر میرے حساب سے تقریباً ڈیڑھ سو جوان لڑکے اور
لڑکیاں بیٹھی تھیں ۔ زیادہ تر جینس اور ٹی شرٹ میں تھیں ۔ کچھ ساڑھی پہنے تھیں ۔ لڑکے
سوٹ ٹائی ۔ شرٹ ٹائی پینٹ اور ٹائی جینس میں دکھائی دئے ۔ کرونا موٹے شیشے کے
کیبن میں گئی ۔ اور اپنا انٹرویو لیٹر پیش کر کے حاضری درج کرادی ۔ چند امیدواروں
کے ساتھ شاید ان کے پتا بھی آئے ہوئے تھے ۔ جو دور چھوٹے ہال میں بٹھادیئے گئے ۔
میں بھی کرونا کو ہمت رکھنے کا کہتا ہوا وہاں جا بیٹھا ۔ کمرہ ایئر کنڈیشنڈ تھا ۔ مجھے بہت
سکون ملا ۔ آنکھیں بند ہوئیں لیکن کان وہاں کی چہ مگوئیوں کو سمیٹتے رہے ۔

''اچھا ۔ دہلی سے آئے ہیں آپ ! بیٹے کا انٹرویو ہے !

''جی ۔ اس نے بھی MBA کیا ہے ۔ اسٹیٹ ٹیم میں رنجی
ٹرافی کرکٹ دو سال کھیلا ہے ۔ نیشنل ٹیم کا برائٹ چانس ہے''

''واہ کیا بات ہے ۔ میرے بیٹے نے MBA کیا ہے ۔ گولڈ میڈلسٹ ہے''
اولمپک میں تیر اندازی ٹیم کا ممبر تھا''

''پھر کوئی میڈل بھی ملا ہوگا ؟''

''بیڈ لک رہی ۔ مگر آج ضرور کامیاب ہوگا ۔ میں انکم ٹیکس کے ممبئی آفس میں
ڈپٹی کمشنر ہوں ۔''

ہر سو اسی طرح کی وزن دار باتیں ہو رہی تھیں۔ میں نے آنکھیں کھول لیں۔ غور سے سنتا رہا۔

آئی۔ پی۔ ایس۔ اور دوسری بڑی سروسز کے اعلیٰ افسروں کے ہونٹ ہلتے تو مجھے ایسا لگتا جیسے وہ '' دیپک راگ گا رہے ہیں اور میرے ارمان شعلوں کی چتا پر جل بھن رہے ہیں۔ رہی سہی آس اُن ادھیڑ حسیناؤں کی ملہار کی بھینٹ چڑھتی گئی جو میرے اندازے کے مطابق بڑے کلبوں اور فائیو اسٹار ہوٹلوں کی کٹی پارٹی کی جان تھیں۔ ان کی رانگنیوں سے صوبائی اور مرکزی وزیروں کے نجی سکریٹریز کے سیکسی سینٹ کی خوشبو میرے نتھنوں میں چبھن پیدا کرنے لگی۔

انٹرویو شروع ہو چکا تھا۔ میرے اعصاب جواب دے رہے تھے۔ ایسا محسوس ہوا جیسے ایئر کنڈیشنڈ ہال کوروکشیتر کا میدان ہو جہاں ہر طرف بھیم اور درونا چاریہ جیسے یودھا ہوں۔ بھلا میری معصوم کرونا ان کے تیروں کو کیسے روک سکتی ہے۔ اسے تو کورو سوئی کی نوک برابر زمین اس ممبئی شہر میں نہیں دیں گے۔ تین بجے تک کافی امیدوار فارغ ہو گئے تھے۔ آدھا ہال خالی ہو گیا کئی درونا چاریہ اور ست رنگی تتلیاں بھی اڑ گئیں۔ تبھی کرونا اس طرف آتی دکھائی دی۔ وہ کسی ڈاکٹر کے وزیٹنگ کمرہ میں بیٹھے مریض جیسی میری حالت دیکھ کر لڑکھڑا گئی۔ میں اٹھا بھی تھا کمزور بیمار کی طرح۔

'' ارے پاپا۔ آپ کو کیا ہوا؟

'' کچھ نہیں بیٹی۔ ایئر کنڈیشن کا عادی نہیں۔ بس سارا جسم اکڑ گیا۔ کہو کیسا رہا انٹرویو؟''

ہمیں دادر اسٹیشن جانا تھا۔ رات پٹھان کوٹ سے ٹکٹ کا بندوبست ضروری تھا۔ لفٹ سے نیچے آئے۔ ٹیکسی سے روانہ ہو گئے۔ کرونا نے بتایا کہ پانچ بڑے افسروں کے سامنے کمپیوٹر تھا جس پر امیدواروں کا پورا بایوڈاٹا آراستہ کیا گیا تھا۔ ہر ایک افسر انٹرویو کے دوران ماؤس پر انگلی رکھتے اور اسے گھماتے۔ سوالات پوچھتے اور بس تھینک

یو کہہ دیتے۔ میں پسینہ میں نہا گیا۔ ہکلاتی آواز میں کہا۔

''ماؤس۔ ماؤس۔ وہ کمبخت یہاں بھی آ گیا۔

ہائے رام۔ بٹی بغیر Key Board کے یہی کلموہا۔

سارا آپریشن کرتا ہے۔۔۔ مجھے نہیں معلوم کب دادر اسٹیشن آیا۔ کرونا میرا ہاتھ پکڑے جیسے ہی پلیٹ فارم پر آئی تو مجھے ہوش آیا اور میں نے غضبناک نگاہوں سے خالی پٹریوں پر جھانک کر دیکھا۔ چوہوں کی فوج معمول کے مطابق کتر بیونت میں مشغول تھی۔

☆☆☆

آخری داؤ

وہی روز روز جیسا انداز، چھاتی تنی، گردن اکڑی ہوئی، دانتوں تلے پان چھالیہ کی اُچھل کود اور انگلیوں میں دھواں دیتی سگریٹ۔ شفو کالیا ویسی ہی اکڑفوں چال سے فولادی گیٹ کے پاس آیا۔ اُس کے چہرہ پر کسی قسم کا کوئی خوف اور پچھتاوا نہیں تھا۔ ورنہ جیل کا فولادی گیٹ دیکھتے ہی اچھے اچھے سورماؤں کا حلق سوکھنے لگتا ہے۔ پیٹ میں گڑگڑاہٹ ہوتی ہے اور پتھروں کی اونچی دیوار اُن کے دل کی دھڑکن کو پل بھر کے لئے جیسے روکنے کی کوشش کرتی ہے۔ خود شفو کالیا جب پچاس سال پہلے وہاں آیا تو زور کے پیشاب کرنے حاجت جتائی تھی اور ہتھکڑی تھامے سپاہی سے گڑگڑایا کہ دیوار کے نیچے پیشاب کرنے دے نہیں تو پائجامہ میں نکل جائے گا۔ اُس دن شفو نے پہلے دایاں پاؤں اندر رکھا تھا اور بعد میں بھی یہی عادت جاری رکھی کیونکہ اُس کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ ایسا کرنے سے کم مدت کی سزا ہوتی ہے اور جیل میں دوسرے مجرموں اور اسٹاف سے خوب سانٹھ گانٹھ بنی رہتی ہے۔

آج بھی اس نے دایاں پاؤں کو برکت کا عمل سمجھا اور چمن لال سپاہی سے آمنا سامنا ہو گیا۔ جس سے پوشیدہ آؤ بھگت کا رشتہ تھا۔ چمن لال زوردار قہقہہ لگاتے ہوئے بول اُٹھا۔

''ابے کالیا۔ کیا ہو گیا تجھے؟۔ شہر میں دل نہیں لگتا۔ یہاں سے گئے تین مہینے بھی نہیں ہوئے اور پھر آ گیا''۔

نوجوانی سے بڑھاپے تک وہ چھ بار جیل آ چکا تھا۔ چمن لال کا اُسے بڑا سہارا تھا۔ پان بیڑی اور کبھی کبھی تندوری مرغا منگوالیا۔ بابا اور اماں کی خیر خبر لا دیتا تھا۔ چمن لال بولتا گیا کہ کل سے دیوار پر تین چار کوے آ بیٹھتے، خوب کائیں کائیں کرتے۔ اُڑ جاتے، پھر لوٹ کر وہی راگ

الا پتے۔ آج بھی آئے تھے۔ اس لئے دِل نے کہا کہیں کالیا تو نہیں آ رہا۔

''اور ایشور قسم ویسا ہی ہُوا۔ تُو آ گیا''۔

ستر سال پہلے جب شفیق ماں کے پیٹ سے باہر آیا تب اس کا باپ قادر عدالت والی سڑک کے کنارے اپنے ٹھکانے پر سائیکل کا پنکچر بنانے میں مصروف تھا۔ پڑوسی بھاگم بھاگ آیا اور باپ بننے کی خوشخبری سنائی۔ دوسرے دن قادر کے ٹھکانے پر جیسے ہُن برسنے لگا۔ ایک سائیکل سے فرصت ملتی کہ دوسری، تیسری اور پھر سائیکلوں کی قطار لگ گئی۔ شام کو اَٹھنّی، چونّیوں کے بوجھ سے قمیض اور پینٹ کی جیبیں اتنی پھول گئیں کہ کھنکھناہٹ دم توڑ گئی۔ خوشی سے جھومتا گھر آیا اور بیوی سے بولا

''ہمارا بیٹا بڑا خوش نصیب ہے۔ اب ہماری قسمت کے دروازے کُھل جائیں گے۔ آج ہی دیکھ لے''۔

قادر نے جیبوں سے ریزگاری نکالی اور تکیہ کے اُس طرف زور سے پٹخ دی جہاں شفیق ماں کی رضائی میں دُبکا ہوا تھا۔

معمولی آمدنی میں قادر کی اوقات نہیں تھی کہ شفیق کو اسکول بھیج سکے۔ اس لئے وہ پانچ سال کا ہوا تو اپنے ساتھ ٹھکانے لے جانے لگا۔ کام کیا خاک سیکھتا۔ ہم عمر لڑکوں کو پتنگ اُڑاتے اور گُلّے کھیلتے زیادہ دن نہیں دیکھ سکا اور اُن میں شامل ہو گیا۔ شفق یونہی بڑھتا گیا۔ اُس کی آوارہ گردی، لڑائی جھگڑے اور تھانہ میں پٹائی کُٹائی قادر اور بیوی کو خون کے آنسو رُلاتی رہی۔ بیٹے کی خوش نصیبی کا جو سنہری خواب دیکھا تھا وہ لوہے کی ہتھکڑی سے ٹکرا کر بکھر گیا۔ شہر بھر میں اُن کا بیٹا شفقو کالیا مشہور ہوتا گیا۔

شفقو ہٹا کٹا نوجوان تھا۔ گالوں پر ہلکے ہلکے بال اُبھرے تھے کہ ایک دن پولس اُسے پکڑنے گھر آ گئی۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ ماں چوکھٹ پر بیٹھی تھی۔ گھبرا کر کھڑی ہو گئی۔

''شفقو کہاں ہے؟ سب انسپکٹر نے پوچھا

''وہ سو رہا ہے!۔

سب انسپکٹر ماں کو ہٹاتے ہوئے اندر گھس گیا۔شفو فرش پر اوندھا پڑا سو رہا تھا۔ سپاہی نے اُسے جھنجھوڑا۔ وہ بوکھلا کر اُٹھ بیٹھا، تب ہی سب انسپکٹر نے شفو کو ہتھکڑی لگا دی۔ ماں بہت روئی، چیخی چلاّئی۔شفو جو کچھ بھی ہو جنم تو اُس نے ہی دیا تھا۔ممتا ویسے بھی پھٹکری ہوتی ہے۔گندے پانی میں ڈالو یا صاف پانی میں گھل جاتی ہے۔مجرم پولس والوں کے ہتھے چڑھ جائے تو اُن کے کان گہرا کنواں بن جاتے ہیں کہ جھانک کر جتنا چیخو، چلاؤ۔آواز اُتنی ہی تیزی سے ویسی کی ویسی واپس آ جاتی ہے۔

شفو اور اُس کے تین دوستوں نے نرائن دت نائب تحصیلدار کے گھر میں نقب لگائی اور دو ہزار مالیت کے زیور لے اُڑے تھے۔جس سنار کو فروخت کئے مخبر کی اطلاع پر پولس نے اُسے دھر لیا۔اُس نے شفو کا نام بتایا جو زیور فروخت کر گیا تھا۔شہر کے تھانوں میں شفیق نام کے تین ہسٹری شیٹر تھے۔قادر کا بیٹا شفیق کوئلہ جیسا کالا تھا۔اس لئے گرفتاری کے بعد کوتوالی میں شفیق عرف شفو کالیا کے نام سے اُس کی آمد درج ہوگئی۔ قادر کا بیٹا اسکول میں ہوتا تو حاضری رجسٹر میں کم از کم عرفیت نہیں لکھی جاتی۔نگرانی بدمعاشوں کے تصاویر والے بورڈ میں شفو کالیا کی تصویر سائیکل کے نئے ٹیوب پر پنکچر کی اُس چھوٹی ربر کی طرح دکھائی دے رہی تھی جسے قادر نے بے دلی سے چپکا دیا ہو

ایک دن کی بات ہوتی تو قادر اور شفو کی ماں کو صبر آ جاتا۔سنٹرل جیل کے فرش پر سینکڑوں ہزاروں مجرموں کے کرتوت مانو ایسا سلوشن لگا گئے تھے کہ شفو کالیا کا بایاں پاؤں باہر آتا تو دایاں پاؤں پھر جیل کے اندر چلا جاتا۔شفو تھا بڑا دوراندیش۔ جب دیکھا کہ لوگ باگ دیواروں کی چنائی سیمنٹ سے کرنے لگے ہیں اور نقب لگانا ممکن نہیں تو دو مہینے علی گڑھ کی ایک گلی میں تالے بنانے والے کے یہاں بیٹھ گیا۔تالے بنانا اور کھولنا اُس نے سمجھ بوجھ سے سیکھ لیا۔قادر کی کمر جھک گئی۔مشکل سے دس پانچ پنکچر بنا پاتا۔ہوا بھرنے میں کئی منٹ لگا دیتا۔سانس پھولنے لگی۔ماں نے رو رو کر آنکھوں کی روشنی دھندلی کرلی۔دونوں اپنی قسمت کو کوستے رہتے۔

عدالت کے باہر پرانی ٹیبل کرسی پر بیٹھنے والے بوڑھے وکیل مدن لال اپنی پرانی سائکل قادر کے ٹھکانے پر کھڑی کر دیتے تھے۔ مدن لال ضلع کلکٹر کے ریڈر تھے۔ ریٹائر ہوئے تو پرانی ٹائپنگ مشین لے کر بیٹھ گئے۔ مگر بھول گئے کہ اب کمپیوٹر کا زمانہ آگیا ہے۔ دن بھر مکھیاں مارتے، اُدھار پنکچر بھی بنوالیا کرتے تھے۔ قادر خاں کو مصیبت میں دیکھ اُس کے پاس آجاتے اور کہہ دیا کرتے کہ بچے غریب کے ہوں یا دھنوان کے۔ شکشا نہ پائیں تو ایسے ہی چھید والے ٹیوب بن جاتے ہیں جو ڈھیر سے اس نے ٹانگ رکھے ہیں۔ ان کے سہارے جیون کے ندی نالے پار نہیں ہوتے۔ قادر تڑپ جاتا۔ اُس کے آنسو نکل پڑتے اور مدن لال سے منت سماجت کرتا

''وکیل صاحب تم تو بہت پڑھے لکھے ہو۔ میری طرف سے ایک عرضی لکھدو۔ سرکار کے نام۔ شفو کو جیل میں ڈنڈے مار مار کے پڑھاؤ لکھاؤ''۔

قادر نے بڑی معصومیت سے یہ بھی لکھنے کو کہا کہ شفو کی چمڑی سرکار کی اور ہڈیاں قادر کی۔ وہ بھول گیا کہ دودھ پھٹ جائے تو مکھن کہاں سے بنے گا۔ مدن لال دُکھی ہوکر وہاں سے چلدیئے۔ وہ رنڈوے تھے۔ بس ایک بیٹی تھی جس کی شادی کی فکر اُنھیں ستایا کرتی تھی۔

شفو کالیا نے ناگواری سے چمن لال کی باتیں سُنیں۔ اُس کی تیوریاں چڑھ گئیں اور جھنجھلا کے منہ کھولا۔

ٹُوکل کا لونڈا ہے۔ ہاتھ میں رائفل کا نشہ۔ ہر ماہ بھاری تنخواہ''۔ اُس کی زبان رُکنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ گورنمنٹ بال بچوں کی بیماری کا خرچ دیتی ہے۔ پنشن بھی ملے گی۔ تم راجہ اور ہم جیسے مجرم تمہارا کھاجا۔ کبھی سوچا انسان مجرم کیسے بنتا ہے۔ چوری ڈاکہ کیوں ڈالتا ہے۔ میں قادر کا اکلوتا بیٹا نہ ہوتا اور وہ چابک مارتا، کھال ادھیڑ دیتا تو شاید جیل کی بجائے اسکول میں بایاں پاؤں رکھ کر داخل ہوتا۔ باپ کی کمائی سے دو وقت کی روٹی مشکل سے ملتی تھی۔ بُرے لڑکوں کی صحبت میں پڑ گیا۔ جس دن مسجد میں جا کر پاک قرآن سر پر رکھا جس کا ایک لفظ نہیں پڑھا تھا اور

قسم کھائی کہ سب دھندے چھوڑ دونگا۔ مگر قسمت خراب تھی۔ ستیاناس ہو یونین کاربائڈ کارخانے کا، اُسی رات ایسا زہر اُگلا کہ ہزاروں کی جان کھا گیا۔ میرے باوا اور اماں سوتے رہے۔ ایسے سوئے کہ پھر نہ اُٹھے۔ شفو نے آگے بتایا اُس رات وہ شہر کے باہر کی دو کالونیوں کی چھان بین کررہا تھا۔ یہ مجرب نسخہ یاد رکھو کہ چوری کا سُنہری وقت رات تین اور چار بجے کا ہوتا ہے۔ جب نیند ساتویں آسمان پر رنگین سپنوں میں کھو جاتی ہے۔

''تُم کیسے بچ گئے؟ چمن لال نے پوچھا

شفو کی زبان بیرک کا تالا کُھلنے تک چلتی رہی۔ کھڑکی کی گرل کاٹنے کا موقعہ نہیں ملا۔ شہر سے لوگ بھاگے آرہے تھے۔ سائیکل، دو پہیہ، کاریں اور ٹرک میں بھیڑ بکریوں کی طرح ٹھسے پھنسے گھبرائے انسان۔ معلوم ہوتا تھا کہ شہر میں زلزلہ آگیا۔ اس بھاگ دوڑ کے چلتے کالونی کے فلیٹوں کی لائٹس جل اُٹھیں۔ کھڑکیاں کھول تماشہ دیکھنے باہر آگئے۔ بس چمن لال شفو بھی بھول گیا۔ ایک سائیکل سوار کو روکا اور پوچھا کیا ہو گیا ہے۔ تب پتہ چلا کہ زہریلی گیس پھٹ پڑی ہے۔ پورا شہر دم توڑ رہا ہے۔ میں بھی سرپٹ ادھر کو دوڑ پڑا جدھر سب جارہے تھے۔ دوسرے دن لوٹا تو گھر میں باوا اماں کی لاش دیکھنے کو ملی۔ سو قسم پوری نہ کرسکا۔ چمن لال نے سب کچھ سنا اور کہنے لگا۔

''اس وقت تیرے ہاتھ پاؤں میں جان تھی۔ اب بڑھاپے میں کیا کر بیٹھا کہ یہاں آگیا''۔ شفو کالیا نے لمبی سانس کھینچی اور بیرک میں جاتے ہوئے بولا

''اب کل بتاؤں گا۔ عدالت تو میری سننے سے رہی''! چمن لال دوسرے دن آیا اور شفو کالیا کے پیچھے پڑ گیا کہ آخر اس نے کون سا جرم کر ڈالا۔ شفو کی آنکھیں بھر آئیں۔ منہ سے نکلتے الفاظ معصوم بچے کی تتلاہٹ میں بھیگے معلوم ہوتے تھے۔

مدن لال وکیل کی بیٹی کوشلیا جب چمن گنج کے وسنت گپتا سے بیاہی تب شفو کالیا جوان تھا۔ پولیس، حوالات اور جیل کے سیر سپاٹے بھی کر چکا تھا۔ مدن لال نے اپنی حیثیت کو دیکھتے ہوئے سادگی سے شادی کے آسیب کو قابو کیا۔ داماد دو سائیکل رکشاؤں

کا مالک تھا جو کرائے پر چلتی تھیں۔ شادی جیسے تیسے ہوگئی۔ محلے کے لوگ حیران ہوئے کہ قدم قدم پر شفو ہر انتظام میں مدن لال کے ساتھ کھڑا نظر آیا۔ ایسا ہی مدن لال کے دیہانت پر ہوا۔ کوشلیا روتی پیٹتی آئی۔ گھر میں پرانی ٹائپنگ مشین، کھٹارا سائیکل اور ایک باوا آدم کے زمانے کی رسٹ واچ تھی جو زیادہ تر بند رہتی، مگر مدن لال بڑے شوق سے اُلٹے ہاتھ کی کلائی پر باندھے رہتے تھے۔ اُس موقع پر بھی لوگوں نے دانتوں تلے انگلیاں داب لیں۔ شفو کالیا آنسو بہاتا دُکھ میں ڈوبا ارتھی کو کاندھا دے رہا تھا۔

شفو کمرہ کے باہر بیٹھا اپنی سفید داڑھی کو انگلیوں سے کھجا رہا تھا کہ کوشلیا اُس کے پاس آکر کھڑی ہوگئی۔ شفو کو بڑی حیرانی ہوئی۔ وہ کچھ کہتا کہ کوشلیا نے آنے کا مقصد بتا دیا۔ دو بیٹے اور بیٹی کا ایک نجی اسکول میں داخلہ ہوگیا ہے۔ کورس اور یونیفارم کے لئے تین ہزار روپیہ کی سخت ضرورت ہے۔ کہیں سے انتظام کرادیں۔

''کہاں سے ملیں گی کتابیں اور کپڑے؟ شفو نے پوچھا

''جین بک سینٹر۔ چمن گنج میں ہے''۔

شفو نے آنکھیں جھکا کر کوشلیا کو کل صبح آنے کا کہدیا۔

دوسرے دن تین بجے دوپہر کو شفو کالیا صدر بازار کوتوالی پہنچا۔ جین بک سینٹر سے تین ہزار روپیہ چرانا قبول کیا۔ تھانیدار کو ۱۱ بجے ہی چوری کی رپورٹ مل گئی تھی اور سب انسپکٹر تفتیش کرنے گیا ہوا تھا

''شفو۔ روپیہ لادے! تھانیدار نے نرمی سے کہا

'' صاحب۔ وہ روپیہ میں نے دان کردیا۔ مجھے جیل بھیج دو''۔ شفو نے ایمانداری سے سب کچھ بتادیا۔

تھانیدار نے سامنے کی دیوار کے بورڈ پر نظر ڈالی تو پل بھر کو لگا کہ شفو کالیا کی تصویر غائب ہوگئی۔

☆☆☆

آخری رات

چندر پرتاپ سنگھ کلکٹر ہو کر رائے پور آئے تو پتنی نرملا سنگھ عالی شان بنگلہ دیکھ کر حیران رہ گئیں۔ دانتوں میں انگلی داب لی۔ ابھی وہ اندر نہیں گئی تھیں۔ کھلے میدان کے آخری حصے کو اس معصوم بچے کی طرح تک رہی تھیں جس کی گیند ٹپا کھا کر کھو گئی ہو۔ لوہے کے نوکیلے کانٹوں دار تار اور اشوکا کے بلند درختوں نے بنگلے کی ڈیڑھ ایکڑ کے قریب کھلے احاطے کو تین طرف سے گھیر رکھا تھا۔ انہیں اپنے پرانے کالج کی گراؤنڈ اس احاطے کے مقابلے میں ماچس کی ڈبیا نظر آئی، جہاں انہوں نے چار سال یونیورسٹی کی ہاکی ٹیم کے لیے گھنٹوں مشقت کی تھی۔

''ہائے رام'' ان کے ہونٹ گول دائرہ بنا کے رہ گئے۔ چندر پرتاپ سنگھ مسکرائے، نرملا سنگھ کا ہاتھ پکڑا اور ڈرائنگ روم میں لے آئے۔ نرملا سنگھ دو سال پہلے ہنی مون منانے آگرے آئیں تھیں اور تاج محل کی خوبصورتی میں ایسی غرق ہوئیں کہ چندر پرتاپ سنگھ قدم قدم پر انہیں گدگدا کے آگے بڑھاتے۔ بڑے اور اونچی چھت والے کمرے، محراب دار کھلے دالان، سفید ماربل کا باتھ روم ٹائیلیٹ اور اپنے مائیکے کے بیڈ روم برابر کا کچن۔ ایک بار پھر نرملا سنگھ کو غش آگیا۔ چپراسی نے جھٹ پانی کا گلاس انہیں دیا۔ چندر پرتاپ سنگھ آفس جانے کے لیے مڑے اور نرملا سنگھ کو آرام کرنے کا مشورہ دیتے باہر نکل گئے۔

کلکٹر چاہے پرانے وقت کا گورا فرنگی ہو یا آج کی جمہوریت میں پلا بڑھا سوٹ بوٹ اور ٹائی باندھے شہری ٹائیگر جیسا۔ اس کی آن بان، رعب و دبدبہ اور قانونی

طاقت جس نے نہ دیکھی ہو وہ گاؤں کا گنوار ہی ہوسکتا ہے، جس کے لیے صرف ناکہ دار اور پٹواری بھگوان کا روپ ہوتے ہیں۔کلکٹر ضلع بھر کا بے تاج بادشاہ ہوتا ہے۔ وہ پل بھر میں ذرّے کو آفتاب بنا دے اور جب چاہے مٹی میں ملا دے۔ اگر صاحب کی آنکھوں میں لال ڈورے تیرنے لگیں، بھنویں تن جائیں اور پیشانی پر بل پڑیں تو سمجھ لو طغیانی آنے والی ہے۔ ماتحت یوں کانپتے ہیں جیسے مکڑی کے جال میں الجھا زرد پتہ اور جس دن کار سے اُترے اور چہرے پر سلمیٰ ستارے جگمگاتے نظر آئیں دفتر کے باہر کھڑے مرجھائے پھٹے پرانے کپڑے پہنے، ہاتھوں میں مُڑے تُڑے سفید کاغذ تھامے نردھن دیہاتیوں کے خشک ہونٹوں پر بھی نمی رقص کرنے لگتی کہ آج ناداری میں بال بچّوں کے لیے دو روٹی کا پرمٹ ضرور مل جائے گا۔ چندر پرتاپ سنگھ نے راجند گاؤں کی تحصیلوں میں تربیت کے دوران پٹواری کے ہتھکنڈے اور جلوے قریب سے دیکھے تھے۔ ایکڑ دو ایکڑ زمین والے آدیباسی کھاتہ کھتونی بنوانے کے لیے ہاتھ جوڑے پٹواری کے آگے پیچھے کتّے سی دُم ہلاتے گھومتے تھے۔ پٹواری بیڑی کا کش لگاتے انہیں یوں گھورتا جیسے سانپ درخت پر لٹکے بیَا کے گھونسلوں میں انڈوں کو تلاش کرتا ہے۔

چندر پرتاپ سنگھ نے آئی۔اے۔ایس۔ امتحان پاس کیا تو پوسٹنگ کے لیے دیش کے کسی ایک صوبے کا انتخاب اس کے لیے جی کا جنجال بن گیا۔ پاپا اور ممی نے صرف بہار پسند کیا۔ ماما کی ضد تھی کہ اتر پردیش جاؤ، وہاں تاج محل ہے۔ کافی بحث کے بعد بہار، اتر پردیش، راجستھان، مغربی بنگال اور مدھیہ پردیش کی پانچ پرچیاں ممی نے بنائیں اور پاپا نے ان میں سے ایک اٹھا لی۔ لاٹری مدھیہ پردیش کے نام کھلی۔

’’چلو! کوئی بات نہیں۔ وہاں جاؤ آدیباسی بہت ہیں

ان کی سیوا کرو۔ وہی تمھاری قابلیت کے اصلی حقدار ہیں‘‘۔ پاپا نے پندرہ

منٹ لیکچر دے ڈالا۔ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولس کے عہدے سے ریٹائر ہوئے تھے۔ چالیس سال کی نوکری میں دو کمرے کا مکان بھی نہ بنا سکے۔ ایمانداری کا پاٹھ پڑھاتے رہے کہ تمھارے ہاتھوں میں لاچار، مفلس اور غریبوں کا نصیب ہے۔ بھگوان کو منہ دکھانا ہے۔ چندر پرتاپ سنگھ سر جھکائے سنتے رہے۔ وہ خوش تھے کہ نئے صوبے میں اہنسا پرمودھرم کی یادگار رسانچی ہے۔ باز بہادر روپ متی کا مانڈو ہے۔ آزادی کے سورما چندر شیکھر آزاد اور تانتیا ٹوپے کی کرم بھومی ہے۔ چندر پرتاپ سنگھ کی سروس کو دو سال ہوئے تھے کہ پٹنہ سے پاپا کا فرمان آگیا۔ ممی نے بہو پسند کر لی ہے۔ جلدی آنے کی ہدایت کی تھی۔ نرملا پربہار گرلس کالج میں لیکچرار اور پرانے زمیدار گھرانے کی اکلوتی بیٹی تھی۔ ایک مہینے کی چھٹی اور نینی تال، آگرہ میں ہنی مون سے لوٹتے وقت چندر پرتاپ سنگھ پٹنہ میں نرملا کو چھوڑ کر ڈیوٹی پر واپس آگئے۔

آزاد ہندوستان کے کئی شہروں میں انگریز بہادر محل نما بنگلے چھوڑ گئے۔ افسر چھوٹا ہو یا بڑی مونچھ والا اعلیٰ عہدے کا۔ لیکن بنگلے ڈیڑھ دو ایکڑ میں بنوائے۔ کھلی زمین اتنی کہ آج کا کسان مالک بن جائے تو سال بھر کھانے کو اناج پیدا کر لے۔ اونچے درخت سر سبز باغ، ٹینس لان، اور کیاریوں میں نت نئے رنگ کی پھلواریاں۔ برسہا برس بیت گئے۔ منتری، کمشنر، کلکٹر اور سپرنٹنڈنٹ پولس آئے اور گئے۔ مگر بنگلے جیوں کے توں موسموں کی مار جھیل کر نکھرتے ہی گئے۔ منتری اور افسر بڑھے۔ نئے مکان بنے۔ سرکاری چاہتی تو ایک انگریز محل میں چار چار منتری نواس کھڑے کر دیتی مگر عوام کے نمائندے لال بتی کی چمچماتی کار اور مسلح باڈی گارڈ کے خمار میں ماضی کو بھلا دیتے ہیں۔ انہیں نہ محلے کی کیچڑ بھری گلیاں یاد رہتی ہیں۔ اور نہ ہی گھر کی ٹوٹی چار دیواری اور چرچراتے پلنگ۔ ان بنگلوں نے دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت کی لگام تھامنے کی جادوئی کاریگری انہیں سکھا دی تھی۔

چندر پرتاپ سنگھ کو رائے پور آئے ایک مہینہ ہوگیا تھا۔ ایک تو کلکٹر دوسرے

سوریہ ونشی راجپوت، ڈنر میں مرغ اور مچھلی کے بغیر نہ خودان کی اور نہ نرملا سنگھ کی بھوک بیدار ہوتی۔ اردلی ہر دن دال چاول اور سبزی ٹیبل پر رکھتا تو دونوں کچھ دیر ایک دوسرے کا منہ تکتے۔ پٹنہ کے گذرے دنوں میں کھو جاتے۔ پتا جی اور ممی نے اپنے اکلوتے وارث کو بچپن سے دودھ، مکھن اور شدھ گھی کے ساتھ مرغا اور مچھلی کے کباب کی ایسی لت ڈالی تھی کہ آئی۔اے۔ایس۔ امتحان ہال میں پیپر پڑھتے وقت دانت سے بوٹی کا ریشہ جب تک نہ نکالتا بُدھی نہیں جاگتی۔ ٹریننگ کے دوران دیہات میں مرغے جب جی چاہے مل جاتے لیکن رائے پور میں مہینے بھر سے چندر پرتاپ سنگھ خود کو جیل کا ایسا قیدی محسوس کر رہے تھے۔ جس کے نصیب میں پانی جیسی دال اور بغیر نمک مرچ کی سبزی ہوتی ہے۔ ہوٹل سے کبھی کھانا نہیں منگوایا کیونکہ انہیں معلوم تھا بھینس کی چربی سے تیار ہوتا ہے۔ نجی اسٹاف اور ضلع کے چھوٹے بڑے افسروں نے ایسے خانساماں کی تلاش میں دن رات ایک کر دیا جسے ایسا نان ویج بنانے میں ملکہ حاصل ہو۔ جو راجپوتی خون میں لاوا سا اُنڈیل دے۔ اس بھاگ دوڑ میں چندر پرتاپ سنگھ کا پی۔اے۔ نریندر کمار بازی مار گیا۔ کلکٹر کے جوتوں کی چرچوں سنتے ہی اچھے اچھے افسر کی سٹی گم ہو جاتی ہے۔ پی۔اے۔ ایسا سرکاری کارندہ تسلیم کیا گیا ہے جسے سرکس کے ٹائیگر ٹریز کی طرح چرچوں کی دہشت ناک آواز کو مدھم اور تیز کرنے میں ملکہ حاصل ہوتا ہے۔ نریندر دیوالی کی چھٹیوں میں اپنے وطن لکھنؤ آیا ہوا تھا۔ اپنے دوست شاہ نواز کے گھر مرغے کی دعوت میں شریک ہوا تو انگلیاں چاٹتا رہ گیا۔ کریڈٹ کی تو شاہ نواز نے بتایا

''منیر خاں نے بنایا ہے۔ اس کے جدِ امجد اودھ کے شاہی باورچی خانہ میں ملازم تھے۔''

''کیا کرتا ہے؟'' نریندر نے پوچھا۔

شاہ نواز کے مطابق منیر خاں دو چار ہوٹلوں میں اسپیشل ڈش تیار کرتا ہے۔ اور

کبھی کبھی دعوت ، پکنک یا مجلس ہوتو بلایا جاتا ہے۔ دس قسم کا مرغ، گوشت اور مچھلی بنا سکتا ہے۔ نریندر کو سنہری موقع مل گیا۔

''تو وہ بے روز گار ہے۔شاہ نواز تم کہو اسے سرکاری ملازمت دلا دوں؟ زندگی عیش سے گذرے گی۔ بال بچوں کی تعلیم اور پھر پینشن''

''نریندر۔ میں اس سے بات کر کے دیکھتا ہوں۔ رنڈوا ہے۔صرف اکیلی ماں ہے''

نریندر اور شاہ نواز نے مل کر منیر خاں کو رنگین سپنے دکھائے۔ پہلے وہ راضی نہیں ہوا اور صاف کہہ دیا کہ باپ دادا کی ہڈیاں لکھنؤ کی مٹی میں دفن ہیں۔انہیں چھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔

''یہاں تمھارا اور کون رہ گیا ہے''۔شاہ نواز نے سمجھایا۔سرکاری نوکری میں چھٹیاں ملتی ہیں۔ جب جی چاہو آجاؤ۔سرکاری مکان ملے گا۔آخر منیر خاں راضی ہوگیا۔ بستر بوریا باندھنے کی تیاری کرلی اور ماں سے پوچھ لیا کہ اسے کوئی اعتراض تو نہیں۔ ہر ماہ بندھی تنخواہ، کوارٹر اور پینشن کا سن کر ماں کی بوڑھی چھاتی کپّے کی طرح پھول گئی اور وہ جھٹ تیار ہوگئی۔نریندر نے رائے پور کے تین ٹکٹ ریزرو کرائے۔لکھنؤ سے رائے پور تک کے طویل سفر میں نریندر پوری نیند نہ سو سکا کہ کہیں منیر خاں ارادہ نہ بدل دے اور واپسی کے لیے کسی اسٹیشن پر نہ اُتر جائے۔جس اسٹیشن پر ٹرین رُکتی وہ پلیٹ فارم پر اتر کر چائے بسکٹ اور سموسے خرید لاتا۔اسے پورا بھروسہ تھا کہ چندر پرتاپ سنگھ اور میڈم کے دل میں اس کا مان سمان بڑھ جائے گا۔ضلع بھر میں پی۔اے۔صاحب۔پی اے صاحب کی رٹ افسروں کے ہونٹوں پر گونجے گی۔دیوالی پر اس کے گھر بھی بند لفافے اور مٹھائی کے ڈبے آئیں گے۔کلکٹر بنگلے میں داخل ہوتے ہی نریندر نے منیر خاں کو سرونٹ کوارٹر دکھایا اور سامان رکھنے کو کہا اور بولا'' تم ہاتھ منہ

دھولو۔ کپڑے بدل کر تیار ہو جاؤ پھر صاحب کے پاس چلیں گے،،

اس نے بنگلہ آفس کے کمرے سے اندر کے لیے فون کا بزر دبایا۔ فون چندر پرتاپ سنگھ نے اٹھایا۔

،،سر۔ میں لکھنؤ سے خانساماں لے آیا ہوں،،

ویری گڈ ۔کہاں ہے؟ چندر پرتاپ سنگھ خوشی سے اُچھل پڑے۔

،،بس بوڑھی ماں ساتھ ہے۔ سرونٹ کوارٹر میں چھوڑ آیا ہوں۔

تھوڑی دیر میں حاضری کراتا ہوں،،

چندر پرتاپ سنگھ نے نرملا سنگھ کو خوشخبری سنائی۔ وہ بیڈروم جہاں کسی زمانے میں ملکہ وکٹوریہ اور جارج ششم کی قد آدم تصویریں لگی تھیں۔ شیشم کی الماریوں میں کانچ کے پیچھے قیمتی شراب کی بوتلیں صاف صفائی کرنے والے خادم کو دور سے ہی مدہوش کر دیا کرتی تھیں۔ پندرہ فٹ اونچی چھت پر لگے پنکھوں کی ٹھنڈی ہوا میں دو سرخ سفید نیم عریاں جسم لندن کے دریائے ٹیمس کی پھرتیلی مچھلی کی طرح مچلتے تھے۔ وہاں جیسے ہی چندر پرتاپ سنگھ کی آواز پہنچی، نرملا سنگھ تڑپ کر بستر سے اٹھیں اور تیزی سے ان کے پاس آئیں۔

،،کہاں ہے خانساماں؟،، وہ چھوٹی تھی اور جب پاپا گھر آتے اسی انداز میں بھاگتی ہوئی دروازے پر آتی اور چلاّ اٹھتی۔

،،کہاں ہے میری ٹافیاں؟،،۔چندر پرتاپ سنگھ نے بتایا کہ نریندر اسے سرونٹ کوارٹر میں چھوڑ آیا ہے۔تھوڑی دیر میں نہا دھو کے آجائے گا۔

منیر خاں کے لکھنوی آداب، تمیز اور سلیقے نے پتی پتنی کا دِل جیت لیا۔ مرغ مسلم، مرغ اور مچھلی کے شامی کباب، معظم شاہی مچھلی، مچھلی قورمہ اور نرگسی کوفتے سے لے کر ناشتے میں خاگینہ میٹھا اور نہ جانے کتنی قسم کی سبزی اور دال کی ڈشیز بنانے کی تفصیل چندر پرتاپ سنگھ نے ویسے ہی دھیان سے سنی جیسے وہ اپنے اجلاس پر مقدمات

سنتے تھے۔ انہیں تسلی ہوئی کہ دو ماہ کی حاملہ نرملا کو اب صحت بخش کھانا ملے گا۔ پہلے دن منیر خاں دیسی مرغا لایا۔ ماں کے ساتھ مل کر ذبح کیا تو تینوں اردلیوں نے آنکھیں موند لیں۔ ان میں ایک امبیکا پرشاد برہمن تھا۔ جو ناگواری سے بولا۔

''رام رام کیسا بھرشٹ کام ہے۔ میں یہاں سے دفتر تبادلہ کرالوں گا'' وہ کراہیت سے منہ پھیر کر لان میں چلا گیا۔ منیر خاں کھال ادھیڑ کے مرغے کو نل کے نیچے بڑی احتیاط سے دھونے لگا۔ جیسے وہ مرغ کو نہیں ننھے بچے کو نہلا رہا ہو۔ اس نے بڑے فخر سے اردلیوں کو مخاطب کیا۔'' ہمارے لکھنؤ میں ایسی ہی صفائی سے مرغا اور گوشت دھوتے ہیں۔''

اس شام جائفل اور جوتری کی خوشبو نے ہواؤں میں ہلکورے لیتی جیسے ہی پولس سپرنٹنڈنٹ کے بنگلے میں دستک دی ان کا السیشین کتا زور زور سے بھونکنے لگا۔ ایس پی کی میڈم بھی چند پل کو سکتے میں آ گئیں۔ خود نرملا سنگھ بے چین ہو کر دو بار کچن میں آئیں۔ منیر خاں کو مصالحہ بھونتے اور پورا مرغا قلعی دار پیتل کی دیگچی میں ڈالتے دیکھا۔ انہیں حیرانی ہوئی جب منیر خاں نے ڈھکن کے کنارے کو ہر طرف سے گوندھے ہوئے آٹے سے بند کیا تاکہ بھاپ باہر نہ نکلے۔ رات کو ٹیبل پر بڑی ڈش میں مرغ مسلم اور دو پلیٹ میں سلاد دیکھتے ہی چندر پرتاپ سنگھ اور نرملا کی باچھیں کھل گئیں۔ چہرے پر گلاب سی سرخی چھا گئی۔ ماش کی سفید دال اور انڈوں کے ساتھ بھُنی ہوئی میتھی کی بھاجی نے بھوک کو مجنوں بنا دیا۔ کافی عرصے بعد انہوں نے پیٹ بھر ڈنر لیا۔

چند ہی دنوں میں ڈیڑھ ایکڑ بنگلے کی ڈائننگ ٹیبل کی اشتہاء انگیز ذائقے کی بھنک ڈویزنل کمشنر سے ہوتی ہوئی آفیسرس کلب تک پہنچ گئی۔ چار و ناچار کمشنر نے چندر پرتاپ سنگھ سے پوچھ ہی لیا۔

''مسٹر سنگھ یہ کون واجد علی شاہی خانساماں آپ کے گھر آ گیا ہے؟'' چندر پرتاپ سنگھ اس سوال کا مقصد سمجھ گئے اور فوراً ادب سے جواب دیا۔

''سر اتوار کو میڈم کے ساتھ ڈنر پر آئیں'' بنگلے آ کر انہوں نے منیر خاں کو اچھی

طرح سمجھایا کہ وہ اپنی مرضی سے اتوار کے ڈنر کی تیاری کر لے۔ ایس پی بھگوتی پرشاد کو بھی دعوت دے دی۔ مرغ مسلّم، شامی کباب کے علاوہ منیر خاں نے بھپوریاں، اور پستے کا کسٹرڈ بھی بنایا۔ دوسرے دن صبح کمشنر نے چندر پرتاپ سنگھ اور بھگوتی پرساد کو اپنے آفس میں بلایا۔

''میں نے فیصلہ کیا ہے کہ اتوار کا ڈنر روٹیشن سے میرے
بھگوتی پرشاد اور چندر پرتاپ کے بنگلے پر ہو۔ منیر خاں کھانا تیار کرے گا''

منیر خاں چھ مہینے میں صرف بخشش کے سہارے ہزار پتی بن گیا۔ تنخواہ الگ بینک میں جمع ہوتی رہی۔ ماں کا بڑھاپا خوشیوں سے کِھل اُٹھا۔ ادھر نرملا سنگھ کی زچگی کے دن بھی قریب آ گئے تھے۔ نرسنگ ہوم میں کمرہ بُک ہو چکا تھا وہ دن بھر منیر خاں کی ماں کے ساتھ باتیں کرتی تھیں۔ پٹنہ سے نرملا سنگھ کی ماں اور ساس بھی آ گئیں اور نانی دادی بننے کی آس میں صبح و شام اونچی آواز میں رامائن پڑھنے لگیں۔ نامور لیڈی ڈاکٹر کی موجودگی کے باوجود نوزائیدہ بچّے کے منہ میں پانی چلا گیا۔ اور سیدھا پھیپھڑوں میں اتر گیا۔ لڑکا ہُوا تھا۔ بہت خوبصورت اور تندرست لیکن اسکی جان کے لالے پڑ گئے۔ ہفتے بھر INCUBATOR میں رکھا لیکن لاکھ جتن کے بعد بھی اسے بچایا نہ جا سکا۔ انگریزی راج کے ڈیڑھ ایکڑ زمین پر بنے بنگلے میں نانی دادی کے ہاتھوں میں رامائن کے پنّے پھڑ پھڑانے لگے۔ آنسو پرنالے کی طرح گرنے لگے اور نرملا سنگھ نے رو رو کے آنکھیں سُجا لیں۔ چپراسی امبیکا پرشاد کی زبان سانپ کی سی لپلپانے لگی۔ دوسرے اردلیوں سے چہ مگوئیاں کرنے لگا۔

''دیکھ لیا جائفل جاوتری کا پھل۔ سالے نکھلوٗ کے
رسوئیے نے خوب بے جبان مُرگے کاٹے اور میڈم کو کھِلائے
سچ مانو گرمی کھا گئی بچّے کو'' منیر خاں کے خلاف اس نے جی بھر کے زہر اُگلا۔

شمشان گھاٹ پر بہت سے افسر اور اسٹاف موجود تھا۔ بھیڑ میں سب سے پیچھے منیر خاں

سر جھکائے کھڑا تھا۔ بچّے کو دفن کرنے کے بعد چندر پرتاپ سنگھ نے اسے جیپ میں بٹھا لیا۔ بنگلے میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ سوریہ ونشی خاندان میں زچگی کے بعد لڑکے کی موت کو ایسا سمجھا جاتا ہے۔ جیسے ہلدی گھاٹ کے میدان میں اندھیرا چھا گیا ہو۔ جیپ سے اتر کر چندر پرتاپ سنگھ باہر لان میں ٹہلنے لگے۔ جب منیر خاں آہستہ قدموں سے سرونٹ کوارٹر کی طرف جانے لگا تبھی چندر پرتاپ سنگھ نے اسے آواز دی۔

''منیر خاں ادھر آؤ۔'' لان میں رُکتے ہوئے وہ بولے۔'' بھئی ہم پر ایک احسان کر سکتے ہو؟

''حکم دیں سرکار'' منیر خاں نے نظریں جھکائے جواب دیا۔ چندر پرتاپ سنگھ بولتے گئے کہ شمشان گھاٹ کے آس پاس کتّے بہتات میں ہیں۔ عام طور سے لوگ کہتے ہیں کہ ان کے پنجوں میں اتنی طاقت ہے کہ منوں مٹّی کھود کے لاش کھا جاتے ہیں۔ کتّے کیا ہیں بھوت پریت ہیں۔ شیڈوں میں مُردے جل جاتے ہیں تو بھی صبح راکھ کے نیچے سے بچی کھچی ہڈیاں نکال کے چباتے رہتے ہیں۔

''کیا تم ہفتے بھر میرے بچّے کی لاش کی وہاں نگرانی کر سکتے ہو۔؟''

منیر خاں کا سارا جسم سُن ہو گیا۔ کاٹو تو خون کی بوند نہ ٹپکے۔ کانوں میں سیٹیاں بجنے لگیں۔ زبان پر نوکیلے کانٹے چبھنے لگے۔ لیکن پٹھانیت نے یکا یک رگوں میں بجلی دوڑا دی۔ اس کے ددھیال کے تین افراد بیگم حضرت محل کے سپاہیوں کے ساتھ انگریز فوج کا مقابلہ کرتے ہوئے قربان ہوئے تھے۔ اپنے باپ کی قبر پر قبرستان کی ہولناک ویرانی میں وہ رات بھر قرآن شریف پڑھتا رہا تھا۔ الہ دین کے جن کی طرح بولا

''جو حکم سرکار۔ غلام حاضر ہے''

ماں کو بتایا تو سر سے دوپٹہ پھسل کے فرش پہ آ گرا۔ خوف سے کانپنے لگی۔ لرزتی آواز میں سمجھایا۔ کہ ایسا ہرگز نہ کرنا۔ اللہ نہ کرے کچھ ہو گیا تو میں پردیس میں کہاں کہاں بھٹکوں گی۔ ہمارے مذہب کے خلاف ہے۔ ایسی غلامی سے بہتر ہے نوکری کو

لات مار۔ بینک سے پیسے نکال اور لکھنو لوٹ چل۔تنخواہ اس بات کی نہیں ملتی کہ مرگھٹ میں کتوں کو بھگائیں۔منیر خاں خاموشی سے سنتا رہا۔ماں تھک کر چُپ ہوگئی۔

آدھے گھنٹے کو ماں کے سامنے نت نئی دلیلیں دیتا رہا اور آخیر میں یہ بھی کہا کہ صاحب اور میڈم کبھی ہم سے ناراض نہیں ہوئیں۔اپنے پریوار کا انگ سمجھتے ہیں۔تہواروں پر دل کھول کر انعام دیتے ہیں۔کتنی عزّت ہے۔اور میں نے لکھنؤ میں کیا خاک کمایا۔

''ذرا بھی فکر نہ کر ماں۔مرگھٹ کے اردگرد اونچی دیواریں ہیں۔
مجھے تو گیٹ کے باہر پہرہ دینا ہے۔''

شام ہوئی اور منیر خاں ہاتھ میں لاٹھی لیے کوارٹر سے باہر جانے لگا تو ماں نے اس کے بازو پر امام ضامن باندھ دیا۔کھانا تیار کرنے کی ذمہ داری کچھ دن کے لیے امبیکا پرشاد کے سپرد کردی گئی تھی۔جیپ باہر کھڑی تھی۔منیر خاں سوار ہوا اور اندھیرا پھیلنے سے پہلے شمشان پہنچ گیا۔جیپ میں سے کرسی اتاری اور کلمہ پڑھ کر گیٹ کے کنارے بیٹھ گیا۔کرسی کے نیچے ڈھیر سے چھوٹے پتھر پیروں کے پاس رکھ لیے۔جیپ ڈرائیور نے بتایا کہ تھا یہ شمشان چار سو سال پرانا ہے۔بجلی کے کھمبے پر وائپر لیمپ جل اٹھا۔اور کافی دور تک روشنی پھیل گئی۔کتے بھونکنے لگے اور منیر خاں جیسے ہی دو چار کو آتے دیکھتا پتھر اٹھا کر انہیں مار بھگاتا۔رات بارہ بجے تک وہ ایسا کرتا رہا۔پتھر ختم ہوگئے تو کھڑا ہو کے زور سے لاٹھی زمین پر مارتا اور اونچی آواز میں ہُش ہُش کہہ کر کتوں کو دور بھگا دیتا۔شاید کتے بھی اس انوکھے کرفیو پر حیرت زدہ تھے۔بیس گز دور سڑک کے کنارے بیٹھے منیر خاں کو کھا جانے والی نظروں سے گھور رہے تھے۔جیسے کہنا چاہتے ہوں کہ یہ جگہ صدیوں سے ہماری ملکیت رہی ہے اور یہاں ہر چیز پر ہمارا موروثی حق ہے۔پانچ چھ کتے دیوار کے چکّر لگا رہے تھے کہ کہیں سے کود کے اندر گھسنے کی جگاڑ ہو سکے۔منیر خاں صبح دیکھ چکا تھا کہ آٹھ بچّے دفن ہوئے تھے۔اسی لیے اس رات

ندیدے کتوں کا جمگھٹ تھا۔ سویرے آٹھ بجے جیپ آگئی اور منیر خاں بنگلے لوٹ آیا۔ ماں شاید رات بھر نہیں سوئی تھی۔ تھکی ہاری باہر بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ کچھ بولے بغیر باتھ روم میں گھس گیا۔ نہا دھو کے آیا اور چادر اوڑھ کر پلنگ پر سونے لیٹ گیا۔ ماں نے کئی بار ناشتہ کرنے کو کہا لیکن وہ گہری نیند میں ڈوبتا گیا۔

پانچویں دن چندر پرتاپ سنگھ نے انتہائی عاجزی اور دوستانہ انداز میں منیر خاں کے کاندھے پر ہاتھ رکھا اور اُداس لہجے میں بولے۔ میں زندگی بھر تمھارا آبھاری رہوں گا۔ ہزاروں میل دور سے آکر تم نے ہمارے دل جیت لیے۔ دیکھو آج آخری رات ہے ہمارے خاطر گذار لو''

''سرکار۔ آپ فکر نہ کریں۔ خادم کی جان حاضر ہے'' اس شام منیر خاں نے کرسی دیوار سے ملا کر رکھ لی۔ پتھر بھی ہر رات سے زیادہ اکٹھا کر لیے۔ روز کی طرح کتے آتے رہے۔ غرّاتے اور بھونکتے بھی رہے۔ لیکن آج ان کے نکیلے دانت کافی دہشت ناک دکھائی دیئے۔ پتھر مارنے اور لاٹھی لہرانے کے بعد بھی ان کے وحشیانہ برتاؤ میں ذرا بھی فرق نہیں پڑا۔ معلوم ہوتا تھا جیسے وہ فیصلہ کن شب خون مارنے کا تہیہ کر کے آئے ہوں۔ منیر خاں نے گھڑی دیکھی۔ ڈیڑھ بج رہے تھے اور اس کی آنکھیں تھکاوٹ کی وجہ سے غنودگی کے خمار میں بوجھل ہوتے ہوتے بند ہوگئیں۔ اس نے اپنے آپ کو گھنے بیان بیان جنگل میں کھڑا پایا۔ چاروں طرف سے خونخوار بھیڑیوں نے اسے گھیر رکھا تھا۔ موت کے خوف سے وہ گلا پھاڑ کے مدد کے لیے چیختا رہا اور بھیڑیے اس پر ٹوٹ پڑے۔ صبح گوالے دودھ کے بھاری کین لیے گذرے تو ان کے ہوش اُڑ گئے۔ شمشان کا کیئر ٹیکر بھی آپہنچا۔ منیر خاں کے پیر سر اور چہرہ بچا تھا۔ وہ لاش پہچان گیا اور چار سو سالہ وراثت کا ساتھ دیتے ہوئے فوراً چندر پرتاپ سنگھ کو فون کیا کہ آپ کے نوکر کی جنگلی جانوروں نے تکا بوٹی کر ڈالی ہے۔

☆☆☆

نجات

ڈاکٹر کاظم رضا نے ٹائلٹ میں مشکل سے اخبار کی دو چار سرخیاں پڑھی ہونگی کہ فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ برسوں سے ان کی عادت تھی۔ صبح اٹھتے ہی گرم گرم چائے پی۔ اخبار اٹھایا اور ٹائلٹ میں جا بیٹھے۔ انہیں بیگم رضا کے پیروں کی چاپ سنائی دی۔ وہ ریسیور اٹھا چکی تھیں۔ اچانک ان کی گھبرائی آواز گونجی۔

''ہائے اللہ۔ کب کیسے!۔ میں ابھی آئی''! وہ بھاگتی ٹائلٹ کے پاس آئیں اور دروازہ پر زور سے ہتھیلی ماری۔

''ذرا جلدی نکل آئیں۔ گھنٹوں لگا دیتے ہیں'' ڈاکٹر رضا کے ہاتھ پاؤں پھول گئے جلدی جلدی پانی سے تھپکیاں دیں۔ جیسے تیسے کمر بند باندھا اور ہڑبڑا کر باہر آئے۔ آنکھیں انجانے خوف سے پھٹی پڑی تھیں۔ آواز حلق میں گھٹ سی گئی۔ بڑی مشکل سے پوچھ پائے کہ کس کا فون تھا۔ کیا ہوا۔ بیگم رضا کی آنکھیں نم تھیں۔

''پروفیسر ناصر کی ڈیتھ ہوگئی''! غمزدہ لہجہ میں بتایا۔ ٹائلٹ میں ہارٹ فیل ہوگیا۔ پندرہ منٹ پہلے کی بات ہے۔ فریش ہونے گئے تھے۔ دیر ہوئی تو بیوی بچوں نے آوازیں دیں۔ دروازہ بھڑ بھڑایا۔ کوئی جواب نہیں ملا۔ ہوش اُڑ گئے اور گھبرا کے دروازہ توڑ دیا۔ سب ہی کے منہ سے دردناک چیخیں نکل پڑیں۔ پروفیسر ناصر اٹالین سیٹ سے نیچے گرے پڑے تھے۔ ڈاکٹر کو بلایا مگر اس نے انہیں مردہ قرار دیدیا۔ ڈاکٹر رضا خود ہائی بلڈ پریشر کے مریض تھے۔ سر پکڑے صوفہ پر بیٹھ گئے۔ آنکھیں موندلیں۔ دھیمی آواز میں بیتی رات کا تذکرہ کرنے لگے۔ گھنٹہ بھر پروفیسر ناصر کے ڈرائنگ روم

میں ماسٹر کمال الدین کے ساتھ گپ شپ چلی۔ ویٹرینری ہاسپٹل سے ریٹائرمنٹ کے مہینہ بھر سے وہ پروفیسر ناصر کے گھر جا بیٹھتے تھے۔ پروفیسر ناصر یونیورسٹی میں عربی کے پروفیسر تھے۔ ماسٹر کمال الدین نے سوال ہی ایسا کیا تھا۔ کچھ پل کے لئے ڈاکٹر رضا کے چہرہ پر شام کا سا دھندلکا چھا گیا۔ وہ بے چینی سے پہلو بدلنے لگے۔

''ناصر بھائی یہ منکر نکیر ہم سے قبر میں کون سی زبان میں سوال کریں گے؟''

پروفیسر ناصر عشاء کی نماز کے لئے تیار بیٹھے تھے۔ بس اتنا بتا کر اٹھ کھڑے ہوئے کہ دونوں فرشتے عربی میں سوال پوچھیں گے۔ بیگم رضا پہلے ہی سے غمزدہ تھیں۔ یہ سب سن کران کی پیشانی پر پسینہ کی بوندیں اُبھر آئیں۔ دوپٹہ جھلنے لگیں۔

''خدا کے لیے قبر اور منکر نکیر کا تذکرہ نہ کریں مجھے ہول اٹھنے لگتا ہے۔ دل بیٹھتا ہے''

اس دن سے ڈاکٹر رضا کے دل میں خوف نے گھر کرلیا۔ اتنے محتاط ہوگئے کہ ٹائلٹ میں اندر سے سٹکنی لگانا چھوڑ دیا۔ دروازہ بند کرتے اور اسٹیل کی بالٹی سٹا کے رکھ دیتے۔ راجدھانی کے صدر ویٹرینری ہاسپٹل میں تیس سال عزت اور دبدبہ سے گذارے۔ اعلیٰ افسران اور منتریوں میں خاصی پوچھ پرکھ رہی۔ عالیشان بنگلوں کے سبزلان پر چھوٹے بڑے ودیشی نسل کے کتے اٹھکھیلیاں کرتے نظر آتے۔ ان میں ایک بھی ایسا نہ تھا جس کے ڈاکٹر رضا نے انٹی ریبیز انجکشن نہ لگایا ہو۔ وقت ضرورت کسی نہ کسی معمولی ناسازی پر گولیاں نہ دی ہوں۔ صاحب اور میڈیم کی ''سٹ اور گو'' کی شفقت میں ڈوبی آواز پر اچھل کود کرتے کتے آنکھیں اور گردن جھکا پاؤں پھیلا کے بیٹھ جاتے۔ چھلانگ لگا کے منہ میں گیند جھپٹ لیتے۔ ایسا برسوں پہلے بھی ان بنگلوں میں ہوتا تھا۔ برطانوی انگلیاں پیانو پر دوڑتیں اور میڈم کا چہیتا کتا ایرانی قالین سے چپک کرلیٹ جایا کرتا۔ سفید ڈریس اور صافہ میں ہندوستانی اردلی دن میں تین بار صاحب کے السیشین کو باہر سڑک پر گھمانے لے جاتا۔ تب اردلی سے زیادہ کتے کی شان اور تندرستی دیکھتے بنتی تھی۔ ان ولایتی آقاؤں کے کتوں کی نسل کے نام تک زبان

میں لکنت پیدا کرتے تھے۔ ڈابرمین، لیبراڈور، السیشین، راٹ، سینٹ برنالڈ اور جانے کیا کیا۔ معلوم ہوتا شیکسپیئر کے ڈراموں کے کردار ہوں۔

کئی بنگلوں کے پچھواڑے سیمنٹ کی چادروں کے شیڈ میں جرسی گائے بھی جُگالی کرتی دکھائی دیتی۔ یہ بھی صاحب کے کتوں جیسی سہولتوں کی حقدار ہوتی۔ ڈاکٹر رضا کی ڈیوٹی ہاسپٹل میں یوں تو عام شہری کی گائے، بھینس، بکرا بکری اور کتوں کے علاج معالجہ کے لئے تھی۔ لیکن تیس سال کی ملازمت کے دوران ایک دن بھی ایسا نہیں گذرا جب کسی آئی اے ایس، آئی پی ایس افسر کی میڈم اور منتری کے پی۔ اے۔ کا فون نہ آیا ہو۔ فون بھی ارجنٹ اور ایسا ہی جیسا عام طور پر آپ ہم اپنے فیملی ڈاکٹر کو کیا کرتے ہیں۔

''ڈاکٹر صاحب جلدی آجایئے۔ ممی کو چکر آرہے ہیں''

''ڈاکٹر مکرجی۔ میں بول رہی ہوں مسز دھوپڑ۔ بڑا بیٹا رنجیت کل سے بخار میں تپ رہا ہے۔ میں کار بھیج رہی ہوں''

ڈاکٹر رضا کا فون سننے کا اسٹائل بھی منفرد تھا۔ گھنٹی بجتی فون اٹھاتے اور بات کرنے سے پہلے بڑی انکساری سے ''نمستے'' کہتے پھر پیغام کانوں میں اتارتے۔

''ڈاکٹر رجا۔'' بولنے والا نمستے کو گارڈ آف آنر کی تھاپ سمجھتا'' میں مسز آچاریہ۔ ابھی آجاتے۔ وہ ہمارے باکسر نے مارننگ سے ابھی تک تین لوز موشن کر دیئے ہیں'' ڈاکٹر رضا کرسی چھوڑ دیتے۔ یہ تو چیف سکریٹری کی بیگم کی کال تھی۔ اُن کے شوہر کا چہرہ دیکھ کر تو بڑے بڑے افسروں کی پلکیں ایسے جھپکتی ہیں جیسے طوفانی ہَوا میں لالٹین کی لَو۔ منتری منڈل کی میٹنگ میں وزیر اعلیٰ کی کرسی کے بغل میں چیف سکریٹری کی کرسی ہوتی ہے۔ شہر بھر جانتا تھا کہ ڈاکٹر رضا کے ہاتھ میں غضب کی شفا ہے۔ دودھ میں دوبار گولی گھول کر ڈالدیں۔ انجکشن لگوالیں بیمار جانور شام تک بھلا چنگا ہو جاتا۔ مگر شرط یہ کہ جانور ودیشی نسل کا ہو۔ یہی نہیں بنگلہ کی قیمتی گائے کی زچگی کے موقع پر بھی ڈاکٹر رضا کی طلبی اسی انداز میں ہوتی جب میڈم کے دردزہ اٹھتے ہی۔ لیڈی ڈاکٹر

بُلائی جاتی ہے۔ رٹائرمنٹ سے پانچ سال پہلے موبائل فون کی وبا آئی اور ڈاکٹر رضا کی جان ذیق میں آگئی۔ وہ آئی جی پولس ماتھر کے لیبراڈور کا پیٹ تھپتھپارہے ہوتے کہ رنگ ٹون آجاتا۔ دوسرا ہاتھ پاکٹ میں ڈال کر موبائل نکالتے اور نمستے کہتے۔ کبھی ثریواستو کمشنر کے ڈابرمین کو چھینکیں آنا اور ناک بہنا۔ اُدھر دوسرے افسروں کے بنگلہ سے بھوک نہ لگنا، مزاج میں چڑ چڑاپن، آنکھوں سے پانی بہنا اور بخار کی شکایتیں۔ کہنے کو وہ ڈاکٹر تھے لیکن راجدھانی میں پوسٹنگ ہونا ڈاکٹر رضا کے لئے کالے پانی کی سزا سے کم نہ تھی۔ وہ اس وقت اپنی ڈگری پر لعنت بھیجتے جب چیف سکریٹری اور ڈائریکٹر جنرل پولس کے کتا۔ کتیا کے جسمانی ملاپ کو اپنی موجودگی میں تکمیل کو پہونچانا پڑتا۔

ڈاکٹر رضا لنچ میں گھر آتے۔ ہاتھ دھوکر ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھتے کہ پشو پالن منتری کی گائے کے نخرے نوالہ ہاتھ سے پلیٹ میں میں رکھوا دیتے۔

''ڈاکٹر صاحب۔ منتری جی کی گائے ایک تھن کا دودھ اتارنے نہیں دیتی۔ بچھڑا بھوکا رہ جاتا ہے''

منتری بھی کیسے ہوتے ہیں۔ گھر کے لئے تینوں تھن نچوڑ لیئے۔ اُن میں سے ہی بچھڑے کو پینے دیتے۔

ڈاکٹر رضا نے یہ سوچتے سوچتے کئی برس گذار دیئے کہ دیسی افسروں اور وزیروں پر ودیشی نسل کے جانور پالنے کا جنون کیوں سوار ہے۔ سڑکوں پر بیشمار گائیں ہڈیوں کا ڈھانچہ لئے بھٹکتی ہیں۔ کچرہ گھر میں منہ مارتی ہیں الم غلم کھاتی رہتی ہیں۔ پلاسٹک کی تھیلیاں تک نگل جاتی ہیں۔ ان کی دردناک حالت پر کوئی نگاہ نہیں ڈالتا۔ اتنا ضرور ہے کہ کروشیا کی بُنی ٹوپی پہنے کوئی سبزی فروش کسی گائے پر لاٹھی برسادے تو بھوک سے نڈھال کمزور اور لاغر چوپایہ ایک دم ''ماتا'' کا روپ دھارن کر لیتا ہے۔ نہ جانے کتنے افسر اور منتری آئے گئے۔ کتے اور جرسی گائیں بھی اوجھل ہوگئیں لیکن ڈاکٹر رضا اپنے کرتو پالن، لگن اور ہاتھ میں شفا کا دفینہ رکھنے کے باوجود بھی ڈپٹی

ڈائریکٹر ویٹرینری سروسز کے عہدہ پر ترقی نہیں پا سکے۔ پروفیسر ناصر کی موت کے بعد اُن کے دماغ میں کئی بار خیال آیا۔ اور آرزو نے بھی بے چین کیا کہ کاش قبر میں منکر نکیر اُن سے پہلا سوال یہ پوچھیں۔

''کیوں ڈاکٹر کاظم رضا اتنی جھک ماری۔ ناپاک جانوروں کی خدمت کی، پھر بھی تجھے پروموشن کیوں نہیں ملا؟ وہ مایوسی سے اس خیال کو جھٹک دیتے کہ سوال تو عربی زبان میں ہوگا۔ وہ جواب کیسے دے پائیں گے۔ اپنے دل میں چنگاری کی طرح سالہا سال سے چٹکتی شکایت کیسے بیان کریں گے۔ ویسے بھی وہ سمجھتے تھے کہ جن کے کتوں اور گایوں کے دکھ درد کی زباں سمجھنے کے لئے پانچ سال ویٹرینری کالج میں جوتے گھسے مگر اُن کا درد جاننے کا افسر اور منتری کے پاس گیان تھا نہ نیت تھی۔ بہر حال اگر موقع ملا وہ منکر نکیر سے ان کے سوال کے جواب میں کہہ دیں گے کہ فرق اُن کی زبان کا ایسا ہی ہے جیسا چتا سے اٹھتے شعلوں کی چر چراہٹ اور قبر میں گرتی بے آواز دو مٹھی مٹی میں ہوتا ہے۔

ان بندھوا مصروفیات کے رہتے ڈاکٹر رضا کے پاس وقت ہی نہیں بچتا تھا کہ وہ پٹن بھائی بکر قصاب کے بکرے، نرائن کھٹیک کی بھیڑیں، چھوٹی ڈیریوں کی گائے بھینس اور دوسرے لوگوں کے پالتو کتا کتیوں کی نت نئی بیماریوں کی طرف توجہ دے سکیں۔ انٹی ریبیز کا مسئلہ سب سے اہم تھا۔ ہاسپٹل کے اسٹور میں جتنے سال بھر کے لئے سپلائر سے لیے جاتے وہ تمام کے تمام بنگلوں کی نذر ہو جاتے۔ دیگر لوگوں کی ضروریات پر وہ بازار سے خریدنے کا مشورہ دیتے اور پرچہ لکھ دیتے۔ جنتا شکایت کرتی کہ انسانوں کے استعمال کی نقلی دوائیں ملتی رہتی ہیں اور اب جانوروں کے لئے بھی ڈپلی کیٹ دوائیں مارکیٹ میں آگئی ہیں۔ حالت ایسی ہی ہے کہ مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔ ڈاکٹر رضا ریٹائر ہو کر جس آخری شام ہاسٹپل کی سیڑھیوں سے اترے۔ ہار پھولوں سے لدے ہوئے انہوں نے اللہ کا شکر ادا کیا۔ ناموری اور عزت کا تاج سر پر تھا۔ پروفیسر ناصر

اور ماسٹر کمال الدین نے صلاح دی اور زور بھی ڈالا کہ وہ پرائیویٹ پریکٹس کریں۔ حویلی نما مکان ہے۔ بڑے آنگن کے دو حصے کردیں تاکہ دوسری طرف بیمار جانوروں کی جانچ کے لئے شیڈ بن جائے۔ایک ہی بیٹا ہے جو امریکہ میں آٹو موبائل انجینئر ہے۔ وہ واپس بھی لوٹا تب بھی مکانیت میں کمی نہیں آئیگی۔ڈاکٹر رضا نے کلینک کھول ہی لیا۔ چند مہینوں میں حال ایسا ہوگیا جیسا عام طور سے شہر میں کسی ماہر اور معروف ڈاکٹر کے یہاں دیکھا جاتا ہے۔مریضوں کو ریسیپشن کاؤنٹر سے ٹوکن دیئے جاتے ہیں اور اسی کے مطابق اپنا نمبر آنے پر مریض کو ڈاکٹر کے چیمبر میں داخلہ ملتا ہے۔

لوگ رسّی تھامے شیڈ کے نیچے بکریاں، گائیں اور بھینس لیے کھڑے رہتے۔ کچھ کے ہاتھ میں کتوں کی زنجیر ہوتی۔ ڈاکٹر رضا کا کمپاؤنڈر ٹوکن کا نمبر پکارتا۔''ایک نمبر کس کا ہے'' جیسے عدالت میں آواز دیتا ہو''موتی لال حاضر ہو''۔بھینس کو گھسیٹتا اس کا مالک قریب کو لاتا۔ڈاکٹر رضا تکلیف پوچھتے۔ پیٹ پر بند مٹھی سے تھپکیاں دیتے۔منہ کھلواتے۔دانت دیکھتے۔چاروں تھن پر انگلیاں پھیرتے۔پھر کمپاؤنڈر سے پرچی لیکر دوائیں لکھدیتے اور ترکیب استعمال سمجھاتے۔''بخار ہے۔اتر جائے گا۔انجکشن صبح شام لگوانا''

ڈاکٹر رضا کی مقبولیت سروس میں رہتے چاروں سمت چھائی ہوئی تھی۔اب ان کے کلینک کی دھوم مچ گئی۔شہرت اور ڈیمانڈ اتنی بڑھ گئی کہ موبائل کی رنگ سننے پر انہوں نے نمستے کہنا چھوڑ دیا۔صرف اپنا لینڈ لائن نمبر بتادیتے کہ اس پر بات کریں۔ فون ان کا کمپاؤنڈر اٹھاتا بنگلہ نمبر نوٹ کرتا، فیس اور ڈاکٹر رضا کے پہونچنے کا ٹائم بتادیتا۔جانوروں کا سرکاری ہاسپٹل اب بھی موجود تھا۔مگر ہاتھ میں غضب کی شفا رکھنے والے ڈاکٹر رضا موجود نہیں تھے۔ان کی خاکساری سے لہکتی ''نمستے'' غائب تھی۔بڑے اور شاہی افراد کے ہاتھوں پر سرسوں جمانے کی بیگار سے انہیں نجات مل گئی تھی۔اب کنسلٹیشن فیس سنتے ہی میڈم میں کتے اور گائے کی تکلیف بیان کرکے کہتا کہ مناسب دوا

فون پر لکھوا دیں۔ لیکن کمپاؤنڈر بے رخی سے جانور کو کلینک پر لانے کی صلاح دیکر فون بند کر دیتا۔ ڈاکٹر رضا کی سوچ بالکل الگ تھی۔ پولس ادھیکاریوں، کلکٹر اور کمشنر کے بنگلہ سے طلبی پر فوراً کان دھرتے اور بنا دیر کیے وہاں پہنچ جاتے۔ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ باعزت طریقہ سے سانس لینے کے لیے ان افسروں کی خوشنودی اتنی ہی ضرورتی ہوتی ہے جتنی آکسیجن۔۔۔!

پروفیسر ناصر کی ناگہانی موت کا غم ڈاکٹر رضا کے اعصاب کے اوپر پھانسی کے پھندے جیسا جھولتا رہا کہ گردن سے دور رہتے ہوئے بھی موت کو دعوت دیتا ہے۔ جب تک جاگتے کسی نہ کسی پل اداسی گھیر لیتی۔ اس دن بھی وہ سب کچھ بھول کر گم سم کلینک سے اٹھے اور ماسٹر کمال الدین کے گھر کا رخ کیا۔ چائے کی چسکیاں لیتے پروفیسر ناصر سے برسوں کے یارانہ کا تذکرہ چھیڑ دیا۔ باتوں کے خاتمے پر یاد آئی تو بس منکر نکیر کی۔ کہنے لگے عربی کے پروفیسر تھے بخوبی فرفر ہر سوال کا جواب دیدیا ہوگا۔ خدا کرے کامیاب رہے ہوں۔

''یہ امتحان تو لازمی ہے۔ ہم تم اور سب کو اس کا سامنا کرنا ہوگا۔ اس سے نجات کا سوچنا کفر ہے''

ڈاکٹر رضا نے وحشت زدہ سے تھکے تھکے گھر میں قدم رکھا اور بیگم رضا اُن کا زرد چہرہ، خشک ہونٹ اور بکھرے بال دیکھ گھبرا گئیں۔

''خدا خیر کرے۔ آج بھی ہر دن جیسا حال بنا رکھا ہے''

وہ منہ لٹکائے صوفہ پر بیٹھے اور کچھ بولتے مگر بیگم نے ٹوک دیا ''دیکھیے جی موت تو برحق ہے۔ آج وہ کل ہماری باری ہے۔ ناصر بھائی کو بھول جائیں''

پسینہ پونچھتے ہوئے ڈاکٹر رضا نے کمزور آواز میں کہا۔

''ناصر بھائی کی جن حالات میں موت ہوئی سوچتا ہوں کہ کیسے عجب اور غیر یقینی سے تھے۔ وہ دونوں ہاتھ سے سر پکڑے بولتے گئے۔ کوئی بیماری نہیں تھی۔ تندرست اور

بے فکر بس کبھی نزلہ زکام ہو گیا۔ ایک دن بھی پلنگ نہیں پکڑا۔ بتایئے بھلا آخری ہچکی لی تو وہ بھی ٹائلٹ میں۔ کلمہ تک پڑھنے کا موقع نصیب نہیں ہوا۔ بتی رات منکر نکیر کی تفصیل بتا رہے تھے۔ بیگم رضا کو اس سے پہلے بھی اس تذکرہ پر وحشت ہوئی تھی۔ خوف سے دل بیٹھنے لگا تھا۔ آج بھی کانپ اٹھیں۔

''میں کہتی ہوں مجھ پر رحم کریں۔ پھر کبھی قبر کے سوال جواب کا ذکر نہ کریں۔ میرا دم گھٹتا ہے''

ڈاکٹر رضا خدا ترس اور رحم دل انسان تھے۔ دھن دولت کی لالچ قطعی نہ تھی۔ حالانکہ وہ روزہ نماز کے سختی سے پابند نہیں تھے۔ لیکن فجر اور مغرب کی نماز پابندی سے پڑھتے۔ دن بھر جانوروں کے امراض کا معائنہ کرتے۔ تب ناپاکی کے چھینٹے ان کی مذہبی سرگرمی پر کاہلی اور اُچاٹ پن کا بوجھ بن جاتے اتوار کو وہ کلینک بند رکھتے۔ لیکن اس اتوار کو محلہ کی مسجد کے قریب رہنے والی شگن کاکی اپنی بیمار گائے کو لیے آدھمکی۔ پچھتر ۷۵ سال کی بوڑھی شگن ڈاکٹر رضا کی پرانی مریضہ تھی۔ گائے کیا تھی بڑھیا کی بیٹی تھی۔ چمن لال پنساری شگن کو بیاہ کر لایا تو اس کی خاندانی گائے ایک سال کی بچھڑی تھی۔ بچھڑی جوان ہوئی تو اُس کی ماں پندرھویں بار جنی لیکن بچہ پیٹ میں الٹ گیا۔ اور وہ مر گئی۔ موجودہ گائے مرنے والی کی بچھڑی تھی۔ ہر سال ایک بچھڑی وہ شومندر میں دان کر دیا کرتی تھی۔ جس دن ڈاکٹر رضا ڈاکٹر ہوئے اس دن سے شگن اپنی گائے کو معمولی سے معمولی تکلیف پر انہیں کے پاس لانے لگی۔ پرائیویٹ کلینک شروع کیا تب بھی اس کا سلسلہ یونہی جاری رہا۔ فیس کے نام پر وہ ساڑھی کے پلو میں بیس روپے کا نوٹ باندھ لاتی۔ گانٹھ کھولتی اس سے پہلے ہی ڈاکٹر رضا اسے ٹوک دیتے۔

''رہنے دے رہنے دے شگن بائی۔ میری طرف سے اسے کھلی چنی کھلا دینا'

نوکر نے اندر آ کر شگن بائی کا بتایا۔ بیگم رضا مسکرائیں اور بولیں ''لیجیئے۔ آ گئی آپ کی مرید۔ سمجھ میں نہیں آتا وہ گائے کو ہاسپٹل کیوں نہیں لے جاتی؟''

''ایسا نہ کہو بیگم۔ پڑوسی اور محلہ دار کا ایک دوسرے پر پورا حق ہوتا ہے''

باہر جاتے جاتے وہ کہتے رہے کہ ہمارا ہی کیا سب کے مذہب ایسا ہی سبق پڑھاتے ہیں۔ یہ ضرور ہے اب ایسے سبق بچے سے پڑھے جاتے ہیں۔ شگن بائی نے ایک ہاتھ سے ماتھا پیٹا اور لجاجت سے کہنے لگی کہ گیا بھن ہے۔ دو دن سے پیٹ بھر کے دانہ نہیں کھا رہی۔ تین بار سے بچھڑا دے رہی ہے۔ ایسی دوا دیں کہ اب کی بار بچھڑی ہو جائے۔ ڈاکٹر رضا نے زور دار قہقہہ لگایا۔ گائے کے پیٹ پر ہاتھ پھیرا دو تین بار تھپکی دی۔ کرسی پر بیٹھنے کے بعد شگن بائی سے پوچھا۔

''بچھڑی کی بڑی چاہت ہے؟''

''ہاں ڈاکٹر جی۔ اب یہ بوڑھی ہو چلی ہے۔ دودھ بھی کم ہو گیا۔'' ڈاکٹر رضا نے گائے کی جانچ کرنے میں مشغول تو تھے لیکن شگن بائی سے باتیں بھی کرتے جاتے۔ لڑکیوں کو پیدا ہونے سے پہلے ہی مار دیتے ہیں۔ لڑکوں کا جنون ہر گھر میں پھیلا ہوا ہے۔ سماج کا آخر کیا ہوگا۔ انسان کی نسل آگے کیسے چلے گی۔

''اور تمہیں، بچھڑی کی چاہت ہے شگن بائی''!

شگن بائی نے گائے کے سر پر ہاتھ پھیرا اور بولا۔

''بیل چھوٹے کسان کے کھیت اور پیٹ کے رکھوالے ہوتے ہیں ڈاکٹر جی۔ یہ گائے ہماری ماں ہے۔'' اس کا کہنا تھا کہ ماں نہ صرف گھر کی مضبوط بنیاد ہے بلکہ اس کی گود میں آنے والے دن پلتے ہیں۔ شگن بائی کی گائے کے کھر سے پانی بھی بہ رہا تھا۔ روگا مرض پنپ رہا تھا۔ ڈاکٹر رضا نے Becamol کا انجکشن لگاتے ہوئے کہہ دیا کہ کل ایک اور انجکشن لگوا لینا تمہاری ماں بالکل بھلی چنگی ہو جائے گی۔ شگن بائی کے چہرے پر تسلی اور اطمینان نکھر آیا۔

ڈاکٹر ڈاکٹر رضا اندر آئے کہ موبائل چیخ اٹھا۔ کیلیفورنیا سے اُن کے بیٹے عبّاس کی کال تھی۔ وہ خوشی سے جھوم اٹھے اور بیگم رضا نے موبائل جھپٹ لیا۔ ممتا دل کا غبار

ہلکا کرنے لگی۔ عباس نے ویزا اور ٹکٹ بھیجنے کی بات کہی۔ اگلے اتوار کی فلائٹ سے دونوں کو اس سے جا ملنا تھا۔ ڈاکٹر رضا رات کے گیارہ بجے تک ماسٹر کمال الدین سے گپ شپ کرتے رہے۔ زندگی میں پہلی بار آسمان میں۔ ستاروں سے تا کا جھانکی اور بچپن کے چندا ماما سے آنکھیں چار کریں گے۔ عباس کے پاس پہونچنے میں کتنے گھنٹے لگیں گے۔ ناشتہ کھانا بھی جہاز میں ملتا ہے۔ ٹائلٹ بھی وہیں اور نیند بھی وہیں۔

''خدا کی پناہ۔ ٹائلٹ میں سب کچھ کرنا ہوگا''

یار کمال الدین یہ تو کمال ہوگیا'' اچانک ڈاکٹر رضا کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ ان کے دماغ کو جھٹکا لگا۔ گھر کے ٹائلٹ کی ٹنکی نہیں لگاتے تھے۔ ہوائی جہاز میں بالٹی رکھنے کو کہاں ملیگی۔ وہ بوکھلائے سے اٹھے اور گھر کی طرف تیز تیز قدموں سے چلدیئے۔ ان کی دیوانگی بیگم رضا پر جھپٹ پڑی۔

''سنیئے۔ ہوائی جہاز میں ٹائلٹ ہے اور اندر ہی سے لاک کرنا پڑیگا''

''تو کون سا غضب ہوگیا''؟

'اجی وہ ناصر بھائی۔۔۔'' بیگم رضا کے ہاتھ پاؤں ڈھیلے پڑ گئے۔

''پھر وہی۔۔۔'' ان کے منہ سے اتنا ہی نکلا اور وہ پلنگ پر بیٹھ گئیں۔

ماسٹر کمال الدین نے صبح ہندوستان ٹائمز کھولا اور پہلے صفحہ کی شاہ سرخی دیکھتے ہی اخبار ان کے ہاتھ سے پھسلنے لگا۔ امریکہ جانے والی فلائٹ ممبئی سے اڑتے ہی مغربی گھاٹ کی پہاڑیوں میں گر پڑی۔ اس کے انجنوں میں آگ لگ گئی۔ جہاز کے جلتے ہوئے ٹکڑے جا بجا بکھر گئے۔ جہاز میں سوار ۲۲۵ مسافر جل کر راکھ ہوگئے۔ ماسٹر کمال الدین کے منہ سے صرف یہی بول نکلے۔

''سوالات سے مل گئی نجات اللہ کے بھید الہ ہی جانے۔ رہے نام اللہ کا''

☆☆☆

رتی لال

رتی لال بغل میں جھاڑو اور سر پر ٹوکری رکھے عشرت یار خاں کی پرانی حویلی سے باہر آیا اور گھر کی طرف چل پڑا۔ بڑے باغ میں پنڈال لگا ہوا تھا۔ چاروں طرف بھگوا جھنڈے لہراتے دیکھ وہ کمپاؤنڈ کی دیوار کے پاس کھڑا ہو گیا۔ جنم اشٹمی کا تہوار تھا اور کوئی مہاتما بھاری آواز میں بھگوان کرشن کے جیون اور گیتا کے اُپدیش پر بھاشن دے رہے تھے کہ برہما نے سنسار کی رچنا کی تھی۔ مائک میں گڑگڑاہٹ ہو رہی تھی۔ رتی لال صرف اتنا سن پایا کہ برہما نے پیر سے شودر پیدا کیے۔ مائک ٹھیک ہوا تو مہاتما جی گنگنائے۔ ''اے کنتی پتر! برہمن، چھتری اور ویش کی سیوا کرنا شودر کا کرتو ہے۔ کرتو جنم کے آدھار پر نشچت ہیں۔ ان میں کوئی خرابی ہو تو ان کو چھوڑنا نہیں چاہیئے۔ سب کام خرابیوں سے ویسے ہی ڈھکے رہتے ہیں جیسے آگ دھوئیں سے'' پہلی بار جنم اشٹمی کے دن راتی لال کی اپنے حسب نسب سے جان پہچان ہوئی۔

وہ پندرہ سال کا ہوا تو باپ نے پُرکھوں کے پیشے کا حصہ دار بنالیا اور دس دن پہلے ہی حویلی کے کام کاج کی ذمہ داری اسے سونپ دی۔ چھوٹا قد، سیاہ رنگ، موٹے ہونٹ اور گھنگھریالے بالوں نے اسے نیگرو سا حلیہ دیا تھا۔ جھاڑو ٹوکری لیے وہ پہلے دن حویلی والی سڑک پر پہنچا تو بچّوں کے غول نے آسمان سر پر اٹھالیا۔ سب گلا پھاڑ کے چیخ رہے تھے۔

''ماں ٹینی باپ کلنگ۔ جن کے بچّے رنگ برنگ''

پھر یہ آواز روز کا معمول بن گئی۔ رتی لال اس چھیڑ خانی کو ماں کے دودھ کی دین سمجھ کر خاموش ہی رہتا اور سر جھکائے حویلی کے دروازہ کی زنجیر کھٹکھٹاتا۔

''بیگم صاحب رتی لال آگیا'' بچّوں کی چیخ پکار تب بند ہوتی جب دروازہ کھلتا اور وہ

اندر چلا جاتا۔ اس طرح رتی لال نے اس سڑک پر پانچ سال گذار دیئے۔ بچے بڑے ہوتے گئے اور ان کی جگہ دوسرے آئے لیکن چھیڑ چھاڑ کا سلسلہ جاری رہا۔ سرکار نے ریزرو کوٹے کی ملازمتیں بھرنے کی مہم چلائی تو رتی لال کو بڑے ہاسپٹل میں وارڈبوائے کی پکی نوکری مل گئی۔ اس دن وہ لکس صابون کی خوشبودار ٹکی لایا اور جی بھر کے نہایا۔ ڈٹ کر مسکرایا۔

''پری بیگم چلی گئیں'' یہ خبر بجلی کی طرح سارے شہر میں دوڑ گئی۔ ہر گھر محلے اور گلی کوچے سے لے کر بازار کی دوکانوں اور نکڑ نکڑ بات چیت کا فوراہ ابل رہا تھا۔ پری بیگم کا نام چاروں سمت گونج رہا تھا۔ عورتیں جھینگر مینڈکوں کی ٹرٹراہٹ اپنے حلق میں سمیٹ لائیں۔ روٹی چولہے چھوڑ پاؤں پسار گھر کی چوکھٹ پر آبیٹھیں۔ جگ ہنسائی اور رسوائی کے نت نئے پینترے اُچھالے۔

''ہائے اللہ۔ خاندان کی عزت مٹی میں ملادی''!

''عشرت یار خاں کی ناک کٹ گئی''!

''پھٹتی جوانی میں بیوگی سے عاجز آ گئی ہونگی''

رتی لال نے اپنی ماں سے سنا تھا کہ پری بیگم کو بھگوان نے اپنے ہاتھوں سے بنایا ہے۔ دیکھنے والے کی پتلیاں چچپا جاتی ہیں۔

''جنت کی حور ہیں پری بیگم''۔ ماں ہونٹ سکوڑ کر بتاتی۔

رتی لال حویلی میں پانچ سال آیا گیا مگر پری بیگم کی ایک جھلک نہ دیکھ سکا۔ اس نے دوستوں سے پوچھا کہ جنت کی حور کیا ہوتی ہے۔ کیسی ہوتی ہے اور کس چیز سے بنی ہوتی ہے۔ اُس کے دوستوں کی بدھی بھی جھاڑو کے تنکوں جیسی تھی۔ وہ حور کے بارے میں کیا خاک جانتے۔ وہ سوچتا برہما نے اس جیسے شودر بیروں سے پیدا کیے ہیں تو پری بیگم کو ضرور اپنے ہاتھوں سے جنم دیا ہوگا۔

عشرت یار خاں کے والد نصرت یار خاں پانچ گاؤں کے جاگیر دار تھے بڑے بارسوخ اور دبدبے والے۔ انگریز افسروں سے خوب یارانہ تھا۔ دور دراز کے صوبوں کے شوقین مزاج، انگریز بارہا ان کے علاقہ میں شیر کا شکار کرنے آتے رہتے تھے اور کئی دن نصرت یار خاں کی مرغن

مہمان نوازی کے مزے لوٹتے۔ آزادی کے بعد بھی ان کی پہلے جیسی حکمت عملی قائم رہی۔ کمشنر، کلکٹر اور پولس افسر مرغ مسلم اور تازہ مچھلی کے ذائقے دار کباب کھانے مہینہ میں دو بار وہاں کا ٹور لگاتے۔ ان تعلقات اور پوچھ پرکھ کے چلتے نصرت یار خاں کو بھنک لگ گئی کہ جاگیرداری زمینداری کے دن لدنے والے ہیں۔ لینڈ سیلنگ کی خبر بھی چھ ماہ پہلے مل گئی کہ فائل چل پڑی ہے۔ آناً فاناً افسروں کے مشورے اور سانٹھ گانٹھ سے انھوں نے فالتو زمینیں فروخت کرنا شروع کر دیں۔ پانی کے قریب کے زرخیز کھیت مقررہ حد میں خود اپنے نام عشرت یار خاں، بہو بیگم اور دونوں پوتے سہیل اور عامر کے نام تحصیل ریکارڈ میں درج کرادیے۔ ان کی آنکھیں بند ہوئیں تو عشرت یار خاں کے نام ٹاٹا کمپنی کے دو کڑور روپے کے شیئرس چھوڑ گئے۔ وہ کہتے تھے ٹاٹا ایسا کنواں ہے جو رہتی دنیا تک پانی سے لبریز رہے گا۔

عامر نے گاؤں میں دودھ ڈیری کھول لی۔ پنجاب سے اعلیٰ نسل کی بیس بھینسیں لے آیا اور وہیں رہنے لگا۔ مہینہ دو مہینے میں گھر کا چکر لگالیا کرتا تھا۔ سہیل کی شادی کا سلسلہ چلا۔ عشرت یار خاں حیدرآباد کے پرانے رئیس کی لعل وزمرد سے آراستہ پری بیگم کو بہو بنالائے۔ پری بیگم سر سے پاؤں تک بیر بہوٹی تھیں۔ بولتیں تو گمان ہوتا پپیہا بول رہا ہے۔ سننے والوں کے کان میں جل ترنگ بج اٹھتے۔ گالوں پہ شفق رنگ اور چوڑی پیشانی امنگوں کے نگینے سے چمکتی تھی۔ آنکھوں میں تاروں سی جھلملاہٹ۔ گھر کی خادماؤں سے ان کے حسن کے چرچے محلے محلے پہنچنے لگے۔ ہر ایک کی حسرت تھی کہ ایک بار جنت کی حور کو دیکھ لیں مگر پری بیگم پردہ کی سخت پابند تھیں۔ حویلی میں دو موٹر کار تھیں پھر بھی وہ گھر سے باہر قدم نہیں نکالتیں کچھ ماہ بعد بہو بیگم پر فالج گرا اور وہ اپاہج ہو کر پلنگ پر لیٹ گئیں۔ عشرت یار خاں نے تجوری کی چابیاں اور گھر کا سارا انتظام پری بیگم کے سر ڈال دیا۔ حویلی کے سارے جھمیلے وہ حوصلے کے ساتھ جھیلنے کو تیار ہو گئیں۔ پرانے وقت کے سنڈاس تڑوا دیئے۔ ہر کمرہ میں چمچماتے ٹائلٹ بن گئے۔ بڑے آنگن میں سبز رنگ کے کوٹہ اسٹون بچھوائے۔ تاکہ خاکروب ہر دن جھاڑو سے خاک نہ اڑا سکے۔ رتی لال جب پری بیگم کا ٹائلٹ صاف کرنے جاتا اپنی ناک پر گمچھا باندھ لیتا۔ لکس صابون کی ہوش رُبا من

موہک خوشبو اور دیوار پر رنگ برنگے ریشمی کپڑے تار تار میں بسی چنبیلی کے عطر کی مہک اُگلتے تو اسے چھینکیں آنے لگتیں۔ اس کے دماغ میں بھونرے جیسی بھنبھناہٹ سرسرانے لگتی۔ سر پر میلا ڈھوتے ڈھوتے گھنگھریالے بالوں کی جڑیں برگد کی جٹاؤں کی طرح سخت ہوگئی تھیں جو بھینی خوشبو کی بلبل سے پھٹنے لگتی تھیں۔ فنائل گھلے پانی میں کپڑا ڈبو کے سفید ٹائلس پر پیروں کے دھندلے نشان صاف کرتے وقت رتی لال کو گمان ہوتا کہ کوئی مجسمہ انگڑائی لے رہا ہے۔ اسے لگتا مانو چاندی سی تلملاتی مچھلی پر ہاتھ رکھ دیا ہو۔ کام سے فارغ ہو کر حویلی سے باہر آتا تو وہ پسینہ میں شرابور ہوتا۔ تھکا ماندہ اور مرجھایا ہوا۔ جیسے کسی بھنور سے نکل کر آیا۔ مہینہ بھر یہ سب کچھ دیکھنے کے بعد ایک بات اس نے گانٹھ میں باندھ لی کہ سہیل بابا اور پری بیگم چنبیلی کے عطر کے شیدائی ہیں۔ عامر بابا خس پر جان چھڑکتے ہیں۔

عشرت یار خاں کی حویلی کو نہ جانے کس کی نظر لگ گئی۔ ان کی مفلوج بیگم ہمیشہ کے لیے رخصت ہوئیں اور چھ مہینے بعد آسمان ہی آ گرا۔ سہیل بابا کی کار کو تیز رفتار ٹرک نے ایسی کاری ٹکر ماری کہ وہ اسٹیرنگ سمیت پچھلی سیٹ تک پچک گئے۔ ان کا پورا دھڑ گٹھری بن گیا۔ رتی لال دوسرے دن آخری بار حویلی آیا تھا۔

اسی دن ہاسپٹل میں آمد دینی تھی۔ سہیل بابا کی مسہری کا فوم کا گدا، چادر، تکیہ، رضائی اور خون آلودہ کپڑے قینچی سے کاٹے گئے کپڑے باندھ کے وہ دہلیز اتر گیا۔ محلے کے بچے خاموش تھے۔ کسی نے اس کی طرف دیکھا بھی نہیں۔ آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے اور وہ خود ہی زور سے چلا پڑا۔

''ماں ٹینی باپ کلنگ۔ جن کے بچے رنگ برنگ''

ہاسپٹل کے لیگل میڈیکو سیل میں رتی لال کی ہنرمندی کے ڈاکٹرس بھی قائل تھے۔ وہ کہتے تھے کہ رتی لال سینکڑوں کی بھیڑ میں آنکھوں کا کاجل چرا کے لاسکتا ہے۔ وہ سب ہی کا بھروسہ مند بن چکا تھا۔ اس دن وہ آٹھ بجے ہی مرچری آ گیا۔ رات بھر گھر میں پری بیگم کی داستان سنتے سنتے سو گیا تھا۔ ہال کا تالا تو کھولا کئی چوہے ادھر سے ادھر بھاگے۔ بڑی ٹیبل پر گھسی

پٹی پلاسٹک بچھی تھی۔ مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں۔ رتی لال نے ٹیبل پر روشنی دینے والا پانچ سو واٹ کا بلب جلایا تو اسے لگا بلب شرابی کی طرح اٹھلا رہا ہے۔

''ہاں۔ پری بیگم جو آ رہی ہیں'' رتی لال بڑبڑایا۔

دسمبر کی کڑاکے کی ٹھنڈ میں رتی لال کی ناک کی نوک سرخ ہو کر بے حس ہو گئی۔ پانی کی بوندسی لرزتی رہی اور اسے خبر تک نہ ہوئی۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد یونہی عادتاً ایپرن کی آستین ناک پر رگڑ لیتا۔ دونوں گالوں پر بھی چنمناہٹ ہو رہی تھی جیسے چیونٹیاں کاٹ رہی ہوں۔ دائیں طرف چھوٹی ٹیبل پر بڑا چاقو، چھوٹی قینچیاں، دو ہتھوڑی اور درانتی دار آریاں کھڑکی سے آتی سورج کی کرنوں سے یوں چمک رہی تھیں جیسے صراف کی دوکان کے شوکیس میں چاندی کے زیور۔ ہال میں ہمیشہ کی طرح خاموشی اور اداسی تھی۔ رتی لال نے تمام آلات کو صاف کیا۔ کچھ دیر مکھیاں اڑائیں پھر دروازہ کے پاس آ کر اسٹول پر بیٹھ گیا۔ سلگتی یادوں کا دھواں آنکھوں کی روشنی جھپٹتا رہا۔ پری بیگم کا ٹائلٹ، چنبیلی کی خوشبو اور فرش پر پاؤں کے ہلکے نشان۔

''جنت کی حور آئیگی! وہ آہستہ سے بولا۔

''پری بیگم نے زہر کھا کے خودکشی کیوں کی؟'' رتی لال اپنے آپ سے پوچھتا رہا۔ نو بجے تھے کہ باہر جوتوں اور اسٹریچر دھکیلنے کی آواز سنتے ہی وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

''آ گئیں پری بیگم''

لاش ریشمی پیلی چادر میں سر سے پیر تک ڈھکی ہوئی تھی۔ پولس کے سپاہی ہاتھ میں کاغذ تھامے ڈاکٹر دوبے کے کمرے کے پاس کھڑے ہو گئے جو دس بجے آتے تھے۔ وارڈ بوائز نے اسٹریچر سے لاش بڑی ٹیبل پر رکھ دی۔

''ذرا سنبھال کے'' رتی لال بولا تو وارڈ بوائز جاتے جاتے ہنس دئے۔

''لو بھئی۔ اب تمھیں سنبھالو''

''ڈاکٹر صاحب نے کہا ہے تم اپنا کام پورا کر لو۔ دس بجے لاش لینے آئیں گے لوگ باگ!''

رتی لال نے دھار دار چاقو اٹھایا۔ آہستہ آہستہ ٹیبل کے پاس آیا۔ تبھی ہوا کا تیز تھپیڑا پھڑک اُٹھا اور پری بیگم کی چادر پیروں تک اڑ گئی۔ رتی لال کی آنکھیں شرم و حیا سے مند نے لگیں۔ ہلکے گلابی رنگ کا کُرتا پیٹ سے کھنچ کر سینہ پر آ گیا تھا۔ سفید چوڑی دار پائجامہ کے ازار بند کی کساوٹ کولہو کے نیچے تک کھسک آئی تھی۔ سرمئی سلوٹوں کے نشان ننھے ننھے کنگروں کی شکل میں ابھرے ہوئے ایسے لگ رہے تھے جیسے کرخت مردانگی نے جنونی انداز میں گدگدی کی ہو۔ کُرتے سے خس کے عطر کا جھونکا رتی لال کے نتھنوں میں گھسا اور اسے زبردست چھینک آئی۔ چاقو ہاتھ سے پھسل گیا۔ اسے بڑا اچنبھا ہوا۔ پری بیگم کے کپڑے چنبیلی کے عطر میں ڈوبے رہتے تھے۔ سر جھٹک کے اس نے چاقو سنبھالا اور ہولے ہولے ٹیبل کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔

''بیگم صاحبہ۔ رتی لال آ گیا''

یوں اس نے حویلی کے آداب و تمیز سے کام شروع کرنے کا ارادہ کیا۔

''ہائے رام۔ یہ مجھ سے نہ ہوگا'' وہ پل بھر کو رکا۔

رتی لال کی آنکھوں میں سنگریزے سے چبھنے لگے۔ چور نظروں سے پری بیگم کو دیکھا جن کی رنگت نیلی پڑ گئی تھی۔ برہنہ بازو، صراحی دار گردن اور ناسپاتی جیسی ٹھڈی کا جائزہ لیتے ہوئے رتی لال کا چاقو اپنا خراج لینے کو بیتاب ہو گیا۔ اسی لمحہ رتی لال ٹھٹکا۔ پری بیگم کی چھوٹی اور درمیانی انگلی میں نیلم جڑی سونے کی انگوٹھیاں رتی لال کے ایمان کی زنجیر کھٹکھٹا گئیں۔ چاقو ٹیبل پر رکھ دیا اور انگوٹھیوں پر زور آزمائش کرنے لگا۔ باہر آہٹ ہوئی تو اس نے ناگواری چھلکاتی آنکھوں سے اس طرح اُدھر کو دیکھا جیسے برگد کے پیڑ میں لٹکی چمگادڑ ابھرتے سورج کو دیکھتی ہے۔ رتی لال نے خاموشی سے دونوں انگوٹھی ایپرن کی جیب میں ڈال لیں۔

''میں چیمبر میں بیٹھا ہوں۔ جلدی کام ختم کر کے آ جاؤ تاکہ رپورٹ لکھ دوں''۔ ڈاکٹر دوبے اندر آئے اور اتنا کہتے واپس لوٹ گئے۔ رتی لال نے دوبارہ چاقو اٹھایا۔

''چل ٹُنّی ماں کے پتر'' پھر تیزی سے ٹھڈی سے لے کر ناف کے نیچے تک ایک ہی وار

میں پری بیگم کا پیٹ چیر ڈالا۔

برفیلی ٹھنڈ میں پیشانی اور چہرہ پسینہ میں شرابور ہو گیا۔ یکا یک چاقو کی نوک پری بیگم کے اس حصہ پر خود بخود ٹھہر گئی جہاں شیطان کی انگلیاں بھی پہنچنے سے خوف کھاتی ہیں۔ رتی لال نے گھبراتے ہوئے ساری آلائش اور آنتیں آہستہ سے پاس رکھی بالٹی میں رکھ دیں۔ جلدی جلدی ٹانکے لگائے اور پیٹ میں ٹانکے لگا کر چادر سے لاش کو ڈھانپ دیا۔ سر اور پیر کی طرف گانٹھ لگا دی۔ دستانے اتار کے وہ سیدھا ڈاکٹر دوبے کے چیمبر میں آیا۔

''سر سب ہو گیا!

''یوٹیرس بھی چیک کر لی رتی لال؟

''جی ہاں۔ سر!

دو دن بعد رتی لال حویلی گیا۔ سڑک پر بچوں کا دور دور پتہ نہ تھا۔ اس نے زنجیر ہلائی۔

''صاحب رتی لال آیا ہے'' نحیف اور کمزور عشرت یار خاں لاٹھی ٹیکتے ہوئے باہر نکلے۔

رتی لال نے خاموشی سے مٹھی میں دبی دونوں انگوٹھیاں ان کو تھما دیں۔

''صاحب۔ پری بیگم کی امانت ہیں''! اس کے گالوں پر دو بوندیں آنکھوں سے رِس کے آ گریں اور وہ تیزی سے مُڑ کر دور ہوتا گیا۔ برہما کے پیر سے جنمے رتی لال نے ناف کے نیچے کا راز اپنی نیکی سے یوں ڈھک دیا جیسے دھواں آگ کو دبا دیتا ہے۔

☆☆☆

للکار

رمو نے خون کا گھونٹ پی لیا۔ کچھ پل اُس کے ہاتھوں پر اُبھری نیلی رگیں سیاہ بارود اُگلنے کو بیتاب سی ہوئیں اور سوکھی ٹہنیوں جیسی سوکھی انگلیاں رائفل کی سنگین بن گئیں۔ اُس کا کمزور جسم زخمی شیر کی طرح چھلانگ لگانے کو مچل اُٹھا۔ اپنے تپتے دماغ پر قابو پاتے ہوئے رمو نے دھیمی آواز میں کہا۔

''رائے ساب، آج کے بعد اِس سیوک کو کبھی چمار نہ کہیے گا۔ بس رمو پکارنا۔''

رائے گوکل داس سکتہ میں آ گئے۔ ایسا لگا رمو کے الفاظ کانوں میں دہکتے انگارے بن کر بکھر گئے۔ وہ بے جان آنکھوں سے ٹکٹکی باندھے رمو کو دیکھنے لگے۔ یقین نہیں آیا کہ دو کوڑی کا آدمی جو بیتے دنوں اُن کے تلوے چاٹتا اور رائے نواس کی چوکھٹ پر سر رگڑتا تھا آج آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے نصیحت ہی نہیں بلکہ دھمکی دے رہا ہے۔ اپنے پِتا رائے بہادر نرمل داس کی موت کے بعد وکرم نگر کے لنگوٹی پہنے کالے کلوٹے لڑکے لڑکیوں کے ہاتھوں میں کاپی کتابیں اور سرکاری پاٹھ شالا میں جاتے دیکھ وہ بخوبی سمجھ گئے تھے کہ رائے بہادروں اور رمو جیسے لوگوں کے بیچ کا فاصلہ گھڑی کی چھوٹی سوئی کے برابر ہو گیا ہے۔ سر پر لکڑی اور میلا ڈھوتے مریل مرد، مردہ جانوروں کی کھال کھینچنے والے موچی، کھلیان اور مویشی کے باڑے میں سوکھی چھاتیوں سے چوہے جیسے بچوں کو چمٹائے گوبر اُٹھاتی عورتوں نے نئے جیون اور خوشحال سماج کا قطب تارا غربت کے چیتھڑے میں باندھ لیا ہے۔ رائے گوکل داس کو یقین ہو گیا کہ وہ سب سوم رس پی کر پربت بننے کو ہیں اور سوتے جاگتے سورگ کے رنگین سپنے دیکھینگے۔

رائے گوکل داس کے پتا نرمل داس یو. پی. کے مشہور وکیل تھے۔ فوجداری مقدموں میں اُن کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ آزادی کی تحریک میں گرفتار باغیوں کی انھوں نے کبھی بھی پیروی نہیں کی۔ اس وجہ سے انگریز حکمراں نے نرمل داس کو رائے بہادر کا خطاب دیا اور بنگلہ بنانے کے لئے وکرم نگر کے وسط میں ایکڑ بھر زمین عنایت کی تھی۔ اُن کے زندہ رہتے نرمل نواس کے صدر دروازہ پر گنپتی براجمان ہوتے تھے۔ کوسوں دور سے انسانوں کا ہجوم درشن کرنے آتا اور لوگ باگ بھگوان گنیش سے زیادہ رائے بہادر کا گُن گان کرتے تھے۔ رائے بہادر کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ دہلی میں تجارت کر رہے اپنے بڑے بھائی کے تیسرے جوان بیٹے گوکل داس کو گود لے لیا تھا۔

گوکل داس باغی خیالات کے جیالے سپوت تھے اور انقلاب پارٹی کا سرگرم ممبر جن کے ذمہ بم بنانے کا بھی کام تھا۔ پتنی امبیکا نے کئی بار انہیں ایسے خطرناک کام سے روکنے کی کوشش کی۔ خود رائے بہادر اوران کی بیوی اسی غم میں سورگباس ہو گئے۔ ایک بار مخبر کی اطلاع پر پولس نے رائے نواس پر دبش دی۔ گوکل داس بھاگ نکلنے میں کامیاب ہوئے مگر جاتے جاتے دو بم پھینک مارے۔ پولس کے چار سپاہی مارے گئے۔ رائے نواس کے چار کمرے اور صدر دروازہ مسمار ہو گیا۔ گوکل داس نہ جانے کہاں روپوش ہوئے اور آزادی کے بعد لوٹے تو نہ اپنے مکان کو پہچان پائے اور امبیکا بھی انہیں بڑے مشکل سے پہچان سکی۔ تین چوتھائی رائے نواس کھنڈر ہو گیا تھا۔ امبیکا نے اس حصے کو فروخت کر دیا تھا۔ ایک ایک پیسہ بچا کر رکھتی اور جیسے تیسے گزارا کیا۔ کھیتی باڑی انگریز سرکار نے ضبط کر لی تھی۔ گوکل داس واپس آئے اور نئی حکومت سے کافی جدوجہد کے بعد زمین واپس لے لی۔ آمدنی کا کوئی ذریعہ نہ تھا کاشتکاری کی زمین ٹکڑوں میں بکتی گئی۔ تنگ دستی میں دن بیتے اور اب بڑھاپے میں کھانس کھانس کر سانس لے رہے تھے۔ آج گوکل داس یہ دن دیکھنے کو زندہ رہ گئے کہ وکرم نگر میں ہر پچاس قدم پر گنپتی جی کی چھوٹی بڑی رنگ برنگی مورتیاں سجنے لگیں۔ یہی حال دسہرہ میں بھی نظر آتا۔ ہری نیلی اور سرخ رنگ کی دل موہ لینے والی لڑیاں جگمگاتیں۔ بجلی کے بڑے بڑے بلبوں کی چکاچوندھ اور مائک پر دھارمک گیتوں کی گونج سے آسمان کے تارے چمکتے بجھتے دکھائی دینے لگے۔ نرمل نواس کا دروازہ سڑگل کے ٹوٹ گیا تھا۔ اُس

کے آس پاس کی موٹی دیواریں بھی مسمار ہوگئیں۔ ہرا یرا غیرا دالان کے تخت پر گوکل داس کو کھانستا دیکھ کر ہنستے ہوئے گزر جاتا۔ تخت کے دائیں طرف طاق میں رکھی بھگوان گنیش کی چھوٹی سی مورتی پر کسی کی نظر نہیں پڑتی۔

رمو کب کا اُٹھ کے جا چکا تھا اور سوچتے سوچتے گوکل داس کی سفید پلکیں اور مونچھیں ہوا کے جھونکے سے دودھ پر جمی بالائی کی باریک سی پرت کی طرح ہلنے لگیں۔ تبھی امبیکا نے آواز دی۔

''اب اُٹھ بھی آیئے کمرہ میں۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی ہے۔''

گوکل داس کے پھیپھڑے کی بیماری سے پسلیوں کے نیچے اُس امرود جیسے لٹک گئے تھے جس کی طوطوں نے کتر کتر کر شکل بدل دی ہو۔ انھوں نے تھکی تھکی آواز میں امبیکا کو قریب بلایا۔

''دیکھتی ہو بھاگیہ وان۔ ایشور تک رسائی کے تین راستوں میں سے اِن جھکمروں اور احسان فراموشوں نے ایک راستہ ڈھونڈ ہی لیا۔''

امبیکا جب بیاہ کر زمل نواس آئی تو پانچویں دن اُس نے آخری بار رائے گوکل داس کی آواز میں غرور کی کڑک سی تھی۔

''امبیکا اِدھر آنا۔'' شیر کی جیسی خوفناک اور دل دہلا دینے والی دہاڑ جو نومبر کے مہینہ میں شیرنی کی ہوسناک چاہت میں جنگل کے درختوں کی جڑیں تک ہلا دیتی ہے۔ وہ بناری ساڑی سنبھالتی گھبراتی دالان کی سیڑھیاں اُترتی گئی۔ گوکل داس گھوڑے سے اُترے اور رائفل اُسے تھما دی۔ پیچھے پیچھے رمو موچی کمر پر ہرن کو لادے ہانپتا کانپتا آنگن میں آیا اور ہرن کی لاش سیڑھی پر رکھ دی۔ امبیکا کے ہوش اُڑ گئے۔ آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ گوکل داس نے بتایا کہ تین سو گز دور ہوگا۔ مگر نشانہ بھی اچوک تھا۔ انگلینڈ کی رائفل اور کارتوس لال قلعہ کی دیوار میں بھی سوراخ کر دیتے ہیں۔ امبیکا جتاتی رہی کہ اتنے سندر ہرن کو مارنا پاپ ہے۔ بے زبان جانور کی پیڑا کبھی کبھی بھگوان کو بھی بے چین کر دیتی ہے۔ آدھی رات گزر گئی تھی اور گوکل داس اپنی پتنی کو سمجھاتے سمجھاتے تھک گئے۔ ہرن کو لیجانے کی پہلے ہی رمو کو ہدایت دے چکے تھے۔ وہ موگرے کے تازہ پھولوں سے مہکتے بستر سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ رائفل کو خاکی غلاف میں بند کیا اور کارتوس

کی پیٹی سمیت اسے شیشم کے بڑے صندوق میں بند کر دیا۔ تالا لگایا اور کنجی امبیکا کو تھما دی۔ بعد میں رائفل اور کارتوس بم دھماکہ کے بعد پولس اٹھالے گئی۔

''ایشور قسم جب تک زندہ ہوں اِسے ہاتھ نہیں لگاؤں گا۔''

رمّو کا ایک ایک شبد رائے نواس میں رکھے شیشم کے صندوق پر دیمک کی طرح چمٹتا رہا۔

امبیکا نے بھیگی زبان ہلائی۔

''کون سا راستہ؟ میں سمجھی نہیں سوامی!''

''شکشا اور گیان کا راستہ بھاگیہ وان۔'' گوکل داس کھانسی کے تیز ٹھسکوں پر قابو پاتے ہوئے بولتے رہے۔ وکرم نگر سے دس میل دور مشنری اسکول میں بگّی میں اسکول جاتے تھے۔ ایسی بگّی کسی بڑے زمیندار کو بھی نصیب نہ تھی۔ موٹر کار کے ٹائر لگے تھے اور عربی نسل کی گھوڑی ہوا سے باتیں کرتی تھی۔ مشکل سے آدھے گھنٹے میں اسکول پہنچ جاتے تھے۔ وہاں دور دور کے علاقوں کے ساہوکار اور برہمن زادے پڑھتے تھے۔ راجپوت گھرانے حسد کرتے کہ کائستھ وکیل کا بیٹا انگریزوں کے دم پر کتنی شان سے چھاتی پھلاتا ہے۔

''آج بھی انگریزی میں بات کروں تو کلکٹر کمشنر سر پکڑ کے بیٹھ جائیں''۔ گوکل داس کھانسی کے زور سے اُٹھ بیٹھے۔ سونے اجاڑ کمرے میں رات گئے تک گوکل داس کی کھانسی اور باہر بستی سے گانے بجانے کی آوازیں سنائی دیتیں تب امبیکا ٹھنڈے ہاتھوں سے پنڈلیوں کو یوں دبانے بیٹھ جاتی جیسے آٹا گوندھ رہی ہو۔ وہ اٹھی اور کھانسی کے شربت کی شیشی اٹھالائی۔ ہر دن صبح سے شام اور کبھی کبھی دیر رات گئے تک وہ گوکل داس سے بیتے دنوں کی ایسی ہی باتیں سنا کرتی جن میں آرزوؤں کے سڑے خون کی بو بسی ہوتی۔ نیند مشکل سے آتی۔ چھوٹے بلب کی روشنی میں چھت کو تاکتی رہتی جس پر برسوں سے سفیدی نہیں ہوئی تھی۔ رائے بہادر نرمل داس کے جیتے ہر سال دیوالی سے پہلے پورے گھر میں پتائی اور دروازہ پر پالش ہوتی تھی۔

''سنتی ہو بھاگیہ وان کل یگ آ گیا ہے۔''

''کیسے سوامی؟''

''دھرم شاستروں نے ہمیں جو سمان دیا وہ ہم سے چھن گیا۔ برہمن ہوں یا ویش اور راجپوت۔اب شودروں کے برابر ہو گئے۔''

امبیکا ہاں میں ہاں ملاتی رہتی۔کوئی دن ایسا نہیں گزرتا کہ گوکل داس کو بجلی سا جھٹکا نہ لگتا ہو۔کبھی خبر ملتی کہ نامدیو ڈوم کا لڑکا پولس میں سپاہی ہو گیا۔نارائن دھوبی اور منجو نائی کے دسویں پاس لڑکے سرکاری نوکری میں لگ گئے۔مہینے کی دوسری تاریخ کو شہر سے آتے تو کبھی ۱۰۰-۱۰۰ کے پندرہ نوٹ اور کبھی نارنجی رنگ کے بیس روپے کے چمچماتے نوٹ ماں کے ہاتھوں میں اس انداز سے تھماتے مانو وہ کاغذ کے نوٹ نہ ہوں بلکہ برہما کا دیا نیا جنم پتر ہو۔ملازمت مل جانے کا پٹاخہ نرمل نواس کی پرانی دیوار سے ٹکرا کے پھٹتا تو گوکل داس دھماکہ سے لرز جاتے۔انھیں محسوس ہوتا زمین پر رینگنے والے کیڑے مکوڑے جو کبھی اُن کی گھوڑی کی ٹاپوں تلے پس جاتے تھے اب اژدہے کی طرح اُن کی وراثت کی ارتھی پر پھن مار رہے ہیں۔وہ بیتی رات بولے تھے۔

''سُن رہی ہو امبیکا۔'' رمو کا باپ ایک مردہ بیل کے عوض میں اپنے دو بیٹوں کو سال بھر کے لئے ہمارے کھیت میں چھوڑ جاتا تھا۔کئی جھونپڑیوں میں ہماری جوار مکا کے کارن چولہے سے دھواں اٹھتا تھا۔شادی بیاہ اور موت میت کے موقعہ پر کوئی نہ کوئی جھولی پھیلائے گھگھایا کرتا تھا۔اب سورج نکلنے سے پہلے بستی میں موٹر سائکلیں دندنانے لگتی ہیں۔شہر کی ٹیلرنگ شاپ پر چھوٹے بڑوں کے کپڑے سلتے ہیں۔سب کے سب باون گز کے ہو گئے۔'' کرم، پُن اور موکش کے بعد منش اگلے جنم میں کسی بھی ذات کا روپ لے سکتا ہے۔'' مندر کے مہنت نے برسوں پہلے گوکل داس کو یہ نکتہ سمجھایا تھا۔

صبح رمو کی چیتاونی نے انہیں بدحواس کر دیا تھا۔اٹھارہ گھنٹے ہو چکے رمو کو گئے ہوئے لیکن اُن کے سرہانے تکیہ کی روئی ابھی تک ایمان سے تر تھی۔

''سنتی ہو بھاگیہ وان۔ رمو کی سنتان بھی اگلے جنم میں برہمن، راجپوت یا ویش ہو سکتی ہے۔''

''میں کیا جانوں سوامی۔آپ آرام سے سو جائیں۔زیادہ سوچتے ہیں تو کھانسی کا دورہ پڑ جاتا ہے۔''

آنکھیں ڈوبنے لگیں تو بھی گوکل داس بولنے سے نہیں چُوکے۔ رمو کے باپ نے نرمل نواس کا نمک کھایا ہے۔ ہم نے بھی اُس کی مدد سے ہاتھ نہیں کھینچے۔ خون نرم گرم ہو جائے مگر رنگ نہیں بدلتا۔

''وہ مجھ سے نفرت نہیں کرتا۔ سویرے اُسے بلوا لینا۔''

''میں خود بُلا لاؤں گی۔ بس سو جائیں سوامی!''

گوکل داس سوتے رہے اور امبیکا بستی سے رمو کو اپنے ساتھ لے آئی۔ راستہ بھر وہ امبیکا کے پیچھے چلتا رہا۔ نرمل نواس کے قریب پہنچا تو ہاتھ جوڑ کے بولا۔

''دُلہن سرکار۔ میرے پتا جی اور خود میں نے آپ سب کی سیوا کی ہے۔ کل میں نے جو کچھ کہا اُسے بے اجتی نہ سمجھیں۔'' امبیکا کچھ نہ بولیں۔ گھر میں آئیں تو گوکل داس کو تخت پر بیٹھے روز کی طرح کھانس رہے تھے۔ رمو کو کھڑا دیکھ طاق میں رکھی گنیش کی مورتی کی طرف اشارہ کیا۔ آنکھیں بھر آئیں۔ کھانسی رُکی اور بھرّائی آواز میں کہا۔

''رمّو۔ بستی والوں سے جا کر کہہ دے گنیش وسرجن کی اگوائی گوکل داس کرے گا۔ ہم سب اسی بستی میں جنمے ہیں۔'' گوکل داس کے آنسو تھمنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔ وہ اکھڑتی سانس میں رمّو کو سمجھانے کی کوشش کرتے رہے کہ آخری بار یہ سمان پانے میں اُن کی مدد کرے۔

''ہاں ہاں رائے ساب۔ اوشیہ۔ سب راجی ہو جائینگے۔ ابھی جا کر بات کرتا ہوں۔''

''سنو نرمل نواس سے خالی ہاتھ نہ جاؤ'' گوکل داس بولے۔

''اٹھاؤ۔ بھگوان کی مورتی اٹھاؤ۔ ہمارے گھر کے باہر استھاپنا کر دو۔''

گوکل داس کی آنکھوں میں اندھیرا سا چھانے لگا۔ امبیکا خاموش کھڑی سب سُن رہی تھی۔ جیسے ہی رمّو نے طاق سے مورتی اٹھائی گوکل داس غش کھا کے تخت سے نیچے گر پڑے۔

☆☆☆

تعارف

نام : سید محی الدین اختر

قلمی نام : نعیم کوثر

پیدائش : ۱۵ر دسمبر ۱۹۳۶ء بیگم گنج ضلع رائسین مدھیہ پردیش

وطن : بھوپال

والدین : سید علی کوثر چاند پوری۔ مستند حکیم اور اردو کے بلند قامت ادیب و افسانہ نگار/محترمہ فاطمہ کوثر (مرحومین)۔
چار بھائی شمیم کوثر، نسیم کوثر، نعیم کوثر اور ڈاکٹر حلیم کوثر۔ دو بہنیں صالحہ ظفر نظامی (مرحومہ) اور میمونہ سلطان،

شریکِ حیات : عائشہ سلطان

اولادیں : (۱) روبینہ کوثر، ایم ایس سی۔ لکچرار (۲) ڈاکٹر فردوس کوثر، ایم۔ ایس۔ ماہر امراضِ چشم (۳) نوید کوثر، ایم کام۔ بینک ملازم۔

ملازمت : مدھیہ پردیش ہاؤسنگ بورڈ بھوپال میں ایڈمنسٹریٹو افسر کی پوسٹ سے ۱۹۹۴ء میں ریٹائرڈ ہوئے۔

ادب سے وابستگی : والدِ محترم کے تخلیقی نظم وضبط سے شعور نے آگہی حاصل کی۔ ذہن ادب کی کائنات سے روشن ہوا۔ محض بارہ سال کی عمر میں پہلی کہانی ''یتیم بچے کی عید'' لکھی جو ۱۹۴۸ء میں ماہنامہ ''نونہال'' دہلی میں شائع ہوئی۔

ادبی سفر : ۱۹۴۹ء بچوں کے لیے طویل کہانی (ناولٹ) ''ہونہار شہزادہ'' حاتمی پبلشنگ ہاؤس حیدر آباد نے کتابی شکل میں شائع کی۔
☆ ۱۹۵۰ء بچوں کے لیے لکھی گئی تقریریں الہ آباد سے کتابی شکل میں شائع ہوئیں۔

پہلا افسانہ : ۱۹۵۰ء، ۱۴ سال کی عمر پہلا معاشرتی افسانہ ''تشنگی'' ماہنامہ جمالستان دہلی نے شائع کیا تھا۔
☆ ۱۹۵۰ء سے ۲۰۰۷ء تک تقریباً ۶۵۰ افسانے لکھ چکے ہیں جن میں بیشتر ہندو پاک کے نمائندہ رسائل و جرائد میں شائع ہو کر نہ صرف عوام بلکہ مشاہیر اہلِ علم وادب سے داد و تحسین پاتے رہے ہیں۔

ڈرامے : ۷۱-۱۹۷۰ء۔ تقریباً دس ڈرامے معاشرتی و اصلاحی لکھے جو وقفے وقفے سے آل انڈیا ریڈیو کی بھوپال اردو سروس سے نشر کیے گئے ان ڈراموں میں صوتی اداکاری بھی کرتے رہے۔

افسانوی مجموعے : پہلا مجموعہ ''خوابوں کا مسیحا'' (کل ۱۹ افسانے) ۱۹۹۹ء دوسرا مجموعہ ''کال کوٹھری'' (کل ۱۸ افسانے) ۲۰۰۱ء اور اب تیسرا مجموعہ ''اقرارنامہ'' (کل ۱۴ افسانے) ۲۰۰۶ء ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی سے شائع۔ چوتھا مجموعہ ''اگنی پریکشا'' ۲۰۰۹ء۔

صحافت : ۱۹۵۹ء بچوں کا ماہانہ رسالہ ''جگنو'' بھوپال سے اپنی ادارت میں شائع کیا اور کامل چالیس سال کی طویل

خاموشی کے بعد ۲۰۰۱ء میں ''صدائے اردو'' جیسا ادبی اور معیاری پندرہ روزہ بھوپال سے جاری کیا جو دس سال کا طویل مگر انتہائی کامیاب سفر جاری رکھے ہوئے ہے ملک کے ہر چھوٹے بڑے شہر کے علاوہ امریکہ، انگلینڈ، ماریشس اور پاکستان کے اردو نوازہاتھوں تک پہنچ رہا ہے۔

سرگرم ہے : کرکٹ ایسوسی ایشن مدھیہ پردیش کے ۱۹۷۶ء میں سکریٹری و نائب صدر رہے۔

شوق : کبھی جب آتش جواں تھا تو معیارِ حسن بھی برقی سامان تھا۔ اب عمر صفات کے دائرے میں ادبِ عالیہ کے مطالعہ تک سمٹ آئی ہے۔ صحت مند ادب فصیل ذوق پر خوشبو کی صدا دیتا رہتا ہے۔

لحہ لحہ سگریٹ پینا عادت میں شمار ہے۔ لباس میں قطعی تراش، خراش نہیں۔ چہرہ ہر روز شیو کیا ہوا کھانے میں کسی خاص اہتمام کی حاجت نہیں۔

مزاج : اکھڑ اور خالص بھوپالی لہجہ۔ بے تکلف نجی محفلوں میں ضابطۂ اخلاق غیر پابند زبان سے ادا ہوتے درشت جملے۔ مزاج شوریدہ سر اس وقت جب کوئی اردو زبان و ادب پر حرف تراش ہو۔ مزاج و طبیعت میں انتہائی جذباتیت، اتنے مخلص کہ اپنوں کی تکلیف پر رو دیں اور ضرورت آنے پر اپنا آپ ہار جائیں۔

نعیم کوثر سے ملیے : ۳۱ رفردوس کاٹیج۔ شملہ ہلس بھوپال ۴۶۲۰۰۱۔ ایم۔ پی۔

فون:۔ 0755-2661576 موبائل:09200000905